عاشوراءمحرّم

روزِعید یاروزِغم؟

از

حکیم ابوالحسن عبیداللہ رحمانی

عرض ناشر

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ علی سید المرسلین وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین، أما بعد!

عصرِ حاضر الحاد و بے دینی اور عقلیت پسندی کا جہاں دور دورہ ہے۔ وہاں توحید و دین پسندی کے لائق علمبردار بھی اسلام کے صحیح موقف کو منظر عام پر لانے میں پیچھے نہیں ہے اور دنیا والوں کے سامنے صحیح اسلامی فکر کا مدلل اور معقول تعارف پیش کرنے میں قربانیاں دی ہیں۔ عصرِ حاضر کے تمام جرائم کا احساس رکھتے ہوئے جامعہ رحمانیہ کاندیولی بمبئی 67 میں شعبۂ دعوت وتبلیغ کا قیام اسی مقصد کا نتیجہ ہے جس کا اولین مقصد خالص قرآن وحدیث کی روشنی میں تبلیغ اسلام سے عوام میں اسلامی تاریخ کا صحیح شعور اور غیر مسلموں میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنا ہے۔

زیر نظر کتاب اس ادارے کا پہلا تحفہ ہے جو اسلامی تاریخ کے صحیح تصور سے مزین اور عام مسلمانوں میں پیدا شیعی عقیدوں کے زہر ہلاہل کا تریاق ہے۔

موجودہ دور میں اکثر مسلمان یوم عاشورہ سے بالکل نا آشنا ہو کر غلط اور باطل افکار کے شکار ہیں اور شہادتِ حسین کی وجہ سے یوم عاشورہ کو اہمیت دے کر غم وماتم کا دن ٹھہرالیا ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے کیونکہ یوم عاشورہ کو عہد رسالت میں عید وسرور کا دن قرار دیا جا چکا ہے، حقیقت پسند قارئین اندازہ لگائیں گے کہ یہ کتاب شعبۂ دعوت وتبلیغ جامعہ رحمانیہ کی وہ پہلی پیش کش ہے جس نے نازیبا اور گھناؤنی حرکت سے مسلمانوں کو کتنا سنبھالا دیا ہے۔

واقعۂ کربلا میں مسلمانوں کی ایک جماعت کو ظالم و دوزخی اور دوسری جماعت کو مظلوم وجنتی قرار دینا حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ ایک شیعی عقیدہ ہے جس نے مسلم گھرانوں میں جنم لیا ہے۔

اس رسالے نے دودھ سے مکھی نکال پھینکنے کی طرح غلط فکر ونظر کی نشاندہی کر دی ہے اور ثابت کیا ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد علی رضی اللہ عنہ بھی سبائیوں کے نرغے میں آچکے تھے۔ سبائی مسلمان نہ تھے بلکہ یہود کی سازشی ایجنسی تھی جس کا کام ہی اسلامی نظام خلافت کو درہم برہم کرنا اور ایک دوسرے سے ٹکرانا تھا وہ نہ اہل بیت نہ بنو ہاشم کے دوست تھے اور نہ بنو امیہ کے ہمدرد تھے بلکہ مستقبل میں اپنے لئے نجات اور خطرہ کی کشمکش میں مبتلا ہو کر اپنی ناپاک سازش سے مسلمانوں کا مسلمانوں کے ہاتھوں خون بہانے میں کامیاب تھے اور حضرت عثمان سے لیکر شہادتِ حسین تک انہیں لوگوں کی سیاہ کاریاں کارفرما تھیں اور بظاہر مسلمان ایک دوسرے کو ملعون گردانتا رہا یہاں تک کہ تاریخ کو غم وماتم کی تاریخ بتائی جانے لگی۔ جو مسلم قوم کیلئے ایک المیہ ہے۔

اس وہمی اور خیالی تصویر سے متعلق یہ مبسوط تحریر بزرگوار مفکر حکیم ابو الحسن عبید اللہ رحمانی نے لکھ کر احسان کیا اور قوم کی رہنمائی فرمائی اور اسے اسلام کے صحیح موقف سے ہمکنار کیا۔ ادارہ ان کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے اپنے علمی نظر وفکر کو اس ادارہ کے ذریعے قوم کے سامنے رکھا۔

اللہ کا کرم ہے کہ آج ہم اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہے ہیں، پہلے ایڈیشن میں کتابت کی کچھ غلطیاں تھیں جنہیں درست کر دیا گیا ہے اور اس کتاب سے متعلق جماعت کے بہت سارے علماء ودانشوران نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جس میں سے ہم چند تاثرات پیش کر رہے ہیں۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب سے قوم کو استفادہ کی توفیق بخشے اور مولانا حکیم عبید اللہ صاحب رحمانی کو اجر عظیم سے نوازے. آمین۔

الطاف حسین فیضی

نگراں شعبۂ دعوت وتبلیغ جامعہ رحمانیہ تحفیظ القران

فروری 1989ء، 1409ھ

عاشوراءمحرم کے متعلق علماء کے تاثرات

خطیب الاسلام مولاناعبدالروف صاحب رحمانی فرماتے ہیں:

آپ کے شعبۂ دعوت وتبلیغ کا یہ وقیع گلہائے رنگارنگ کاایک عالمانہ گلدستہ ہے۔ اسے بہت نفع بخش اورمفید پایا، واقعات کربلا پر ایک گہری نظرڈالی گئی ہے۔قتل عثمان کے بعد خلافتِ علی اورقصاص عثمان کا مطالبہ بہت سے رازہائے درون پردہ کاانکشاف کرتا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت امام حسین رضی اللہ عنہ کامعاویہ سے صلح اورحضرت حسین کی شہادت پرایسے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں جن سے اہل سنت پوری طرح عبرت پذیراورسبق آموز ہوسکتے ہیں۔غداران کوفہ کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہوسکتے ہیں۔تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بات مبنی برحقیقت ہے کہ قتل حسین کے سلسلہ میں یزیدکاکوئی قصورصراحتاًیاکنایۃنظرنہیں آتا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے رسالہ" راس الحسین" میں یزیدکوقتل حسین کے سلسلے میں بالکل بےقصوراوربےگناہ ٹھہرایاہے اوروضاحت کی ہے کہ اس بات میں ان کی کوئی رائے یاسازش نہیں تھی اس لئے یزید پرلعنت ملامت کرنے کے بوجوہ شرعیہ مطلقاًناجائز اورحرام قرار دیاہے۔حکیم ابوالحسن عبیداللہ صاحب نے اپنے اس زریں مقالہ میں اسی حقیقت کاانکشاف کیاہے اورعبرت ونصیحت کی بہت قابل قدر باتیں جمع کی ہیں اورنظریۂ شیعیت کاپردہ چاک کیا۔اللہ تعالیٰ اس پرمصنف کوجزائے خیر دے،اورناشرشعبہ دعوت وتبلیغ کوایسے گرانقدرمقالات شائع کرنے کی توفیق بخشے۔آمین

مشہور صحافی وادیب

بدرعظیم آبادی فرماتے ہیں:

جناب بدرعظیم آبادی مشہورسلفی ادیب، جرنلسٹ وڈائریکٹر اقصی اکیڈمی لکھتے ہیں: کاش واقعہ کربلا نہ ہوا ہوتا اور اگر یہ دلدوز دردناک جگر خراش اورشرمناک واقعہ نہ ہوتا تو سینۂ اسلام داغدار نہ ہوتا اورتاریخ اسلام کے دامن پر خون کا دھبہ نظر نہیں آتا.اسلام امن وشانتی اورمحبت و ملاپ کا مذہب ہے.واقعات کربلا اس تصور پرکاری ضرب ہے اس واقعے کے بعد ملت اسلامیہ مستقل طور پر انتشار اورافتراق کا شکار ہوگئی اوراس واقعہ کی کوکھ سے وہ موقع پسند ابن الوقت اورمفاد پرست فرقہ پیدا ہوا جس نے پاک وصاف اسلامی معاشرہ کوغلیظ اور متعفن بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اوراپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کیلئے بے بنیاد من گھڑت شر انگیز اورفتنہ پرور داستانوں کاانبارلگا دیا.حق وناحق اس طرح خلط ملط کردیئے گئے کہ دونوں میں تمیز محال ہوگئی.غلط فہمی کا دبیز پردہ آنکھوں پر اس طرح پڑا کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی حق وصداقت کی روشنی سے محروم ہوگیا.لہٰذا ماضی میں ہمارے بعض بزرگ اہل قلم نے تاریخ وتحقیق کی روشنی میں سفید کو سیاہ سے الگ کرکے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے مگر ایک فرقہ نفاق وانتشار کی تاریکی اس قدر شدّومدّ کے ساتھ پھیلانے کی کوشش کرتا رہا ہے کہ بار بارشمع حق جلانے کی ضرورت پڑتی ہے.چنانچہ بزرگ عالم ومحقق حکیم عبیداللہ رحمانی نے تاریخ کی روشنی میں بڑی محنت وجستجو کے ساتھ سادہ وسلیس زبان میں بہت سا مواد اکٹھا کردیا ہے جوعوام وخواص کے لیے مفید اورلائق مطالعہ ہے.شعبۂ دعوت وتبلیغ جامعہ رحمانیہ کاندیولی بمبئی قابل مبارک باد اوراس کا یہ پہلا تحفہ لائق ستائش ہے.اللہ کرے ان دعوتی وتبلیغی تحائف کاسلسلہ درازتر ہو اوررب کریم جویائی حق کی کاوشوں کو قبول فرمائے.آمین

عاشوراءِمحرّم

روزِعید یاروزِغم وماتم؟

محرم عربی اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے، جو اللہ پاک کے دین میں سراپا حرمت وعظمت و برکت کا مہینہ ہے۔اسی طرح قمری سال کے بارہ مہینوں میں رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے مہینے بھی معظم اور محترم قرار دیئے گئے ہیں۔اسلام چونکہ اللہ کا دین قدیم ہے اس لیے تمام اگلی شریعتوں میں بھی ان چار مہینوں کی حرمت وعظمت مسلّم رہی ہے: إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ

”مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک کتاب اللہ میں بارہ ہے،اسی دن سے جب سے آسمان وزمین کو اس نے پیدا کیا ہے اس میں سے چار حرمت وادب والے ہیں۔یہی درست دین ہے،تم ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔“ (التوبہ:36)

عرب جاہلیت کے لوگ جو خود کو دین ابراہیمی کا پیروکار کہتے تھے وہ بھی ان مہینوں کا احترام کرتے تھے اور اس میں باہم قتل وقتال یالوٹ مار اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینے سے اجتناب کرتے اور اگر وہ ان حرمت والے مہینوں میں کبھی قتل وقتال کا ارادہ کرتے تو بھی کم از کم ان مہینوں کی ظاہری حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی ترتیب میں تقدیم وتاخیر سے کام لیتے تھے۔مثلاً محرم میں قتل وقتال کی ضرورت پیش آگئی تو اپنے سرداروں سے اعلان کرادیا کہ امسال صفر کا مہینہ پہلے اور محرم کا مہینہ اس کے بعد ہوگا۔یعنی محرم کی حرمت کا قرض ماہ صفر میں ادا کیا کرتے تھے۔ان کے اس عمل کو ”نسی“ کہا جاتا تھا: إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ

”نسی یعنی مہینوں کا آگے پیچھے کر دینا کفر کی زیادتی ہے اس سے وہ لوگ گمراہی میں ڈالے جاتے ہیں جو کافر ہیں۔ایک سال تو اسے حلال کر لیتے ہیں اور ایک سال اسی کو حرمت والا کر لیتے ہیں، کہ اللہ نے جو حرمت رکھی ہے اس کے شمار میں تو موافقت کر لیں پھر اسے حلال بنالیں جسے اللہ نے حرام کیا ہے انہیں ان کے برے کام بھلے دکھادیئے گئے ہیں اور قوم کفار کی اللہ رہنمائی نہیں فرماتا۔“ (التوبہ:37)

یوں تو ماہ محرم از اول تا آخر حرمتوں، برکتوں اور عظمتوں سے بھرپور ہے لیکن اس کی دسویں تاریخ جسے ” عاشوراء“ کہا جاتا ہے اس کی مستقل ایک شرعی حیثیت ہے۔اسی روز سعید میں اللہ رب العزت نے جناب موسیٰ علیہ السلام اور قوم بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات بخشی تھی چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے مسلمانوں نے اس دن کو شکر وسپاس اور خوشی کا دن قرار دے کر روزہ رکھا۔روزہ کا حکم مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد ہوا۔رمضان کے روزوں کی فرضیت سے قبل رسول پاک اور صحابہ عاشوراء کا روزہ غایت درجہ اہتمام سے رکھا کرتے تھے لیکن رمضان کی فرضیت کے بعد عاشوراء کے روزے پر پہلے جیسا اہتمام تو نہ رہا لیکن خود رسول اللہ ﷺ نے برابر عاشوراء کا روزہ رکھا۔مدینہ میں یہود بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔آنحضرت ﷺ نے دریافت کیا کہ: تم لوگ کیا سمجھ کر یہ روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ: اسی دن اللہ نے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو فرعون پر فتح عطا کی تھی تو حضرت موسیٰ نے اس دن روزہ رکھا تھا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ: میں

زیادہ حقدار ہوں کہ اس شکر وسپاس میں موسیٰ کی ہمنوائی کروں. چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: "لَئِنْ بَقِيتُ إِلَى قَابِلٍ لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ"

اگر میں آئندہ سال بقیدِ حیات رہا تو نویں اور دسویں تاریخ کو روزہ رکھوں گا.

اور ایک روایت میں ہے: "صوموا يوم التاسع والعاشر وإحدى عشر"

"تم نویں، دسویں، گیارہویں تاریخ میں روزہ رکھو."

یہ رہی اس ماہ مبارک ومحترم کی اصل شرعی حیثیت کے یہ دن اللہ کی نعمت کے شکر وسپاس کا ہے نہ کہ غم واندوہ اور گریہ وماتم کا۔ اب یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ آئندہ اسی روز سعید کو 60ھ میں ایک انتہائی اندوہناک اور غم انگیز واقعۂ کربلا بھی پیش آگیا جس میں سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے تمام اعوان وأنصار نے ظالم اور بے رحم دشمنوں کے ہاتھوں شہادت پائی لیکن عاشوراء کے دن اس واقعہ کربلا کے پیش آجانے سے اس کی اصل شرعی حیثیت تو نہیں بدلی جاسکتی۔ دین وشریعت کی تکمیل تو محمد ﷺ کی حیات پاک میں ہو چکی اور ہر دینی وشرعی چیز کی دینی وشرعی حیثیت بالکل متعین ہو چکی ہے۔ بعد میں پیش آنے والے حالات واقعات تبدیل نہیں کر سکتے: "الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا"

"آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا۔"

لہٰذا عاشوراء محرم الحرام کو عزاداری اور ماتم اور سینہ کوبی سے تبدیل کرنا سراسر دین وشریعت پر ظلم اور بے راہ روی اور بے دینی ہے۔ اہل اسلام کو ایسی لغو اور بے ہودہ رسموں سے پرہیز لازم ہے۔ جب احکام الٰہی کا پاس ولحاظ اٹھا دیا جائے تو محبت خدا اور رسول کے کیا معنی ہے؟ اور جب رسول کی رسالت ہی کا پاس واحترام باقی نہ رہا تو رسول کے اہل بیت سے دعویٰ محبت کیا چیز رہی؟ سیدنا امام حسین نواسۂ رسول ہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں. لہٰذا اشرفِ رسالت، اللہ کی نسبت سے ہے. جب اللہ نہیں تو رسول کس کا؟ اور جب رسول نہیں تو اہل بیت کس کے؟ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جس دین اور شریعت کو اللہ نے اپنے رسول کی معرفت بھیجا ہے اس کا پوری طرح پاس ولحاظ کیا جائے۔

یوم عاشوراء اسلامی تاریخ میں خوشی اور شکر کا دن قرار دیا گیا ہے۔ اب ہمیشہ یہ دن اسلام کی نظر میں خوشی اور شکر کا ہی دن رہے گا جیسے عید الفطر اور عید الاضحی کے ایام خوشی اور شکر کے دن قرار دیئے گئے. لہٰذا ان ایام کو گریہ وماتم ورنج والم کے ایام قرار دینا سراسر کفرانِ نعمت ہے۔ خواہ ان میں کیسا ہی غم انگیز حادثہ رونما ہو جائے لیکن ان ایام کی مستقل حیثیت وہی رہے گی جو اسلام نے ٹھہرائی ہے۔

بعض مشرک اقوام اپنے مذہبی تہواروں میں اپنے کسی عزیز کے فوت ہو جانے پر چند سالوں تک خوشی نہیں مناتے لیکن وہ بھی مستقل طور پر ہمیشہ کے لئے ان تہواروں کو غم کا دن قرار نہیں دیتے بلکہ ان کی اصلی حیثیت کے مطابق ان کو خوشی کا دن ہی سمجھتے ہیں لیکن افسوس کہ امت مسلمہ کے ایک طبقہ نے عید عاشوراء کو مستقل طور پر غم والم کا دن قرار دیا ہے۔

شہداءِ کربلا پر ماتم کیوں؟

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھی 60ھ میں کربلا کے مقام پر ظلماً شہید کئے گئے۔ اگر ہم واقعتاً انہوں نے شہید جانتے اور مانتے ہیں اور اس قرآنی حقیقت پر ہمارا یقین ہے کہ: الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ

"جو لوگ راہ خدا میں مارے جاتے ہیں وہ مردہ نہیں زندہ ہیں اور اپنے رب کے نزدیک روزی پاتے ہیں۔" (آل عمران:169)

تو ان پر سال بہ سال نوحہ خوانی اور گریہ وماتم کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا رسول پاک کے ہمراہ بدر وأحد میں لڑ کر شہید ہونے والوں میں سے کسی ایک پر بھی گریہ وماتم کی ضرورت آنحضرت ﷺ کی زندگی میں یا آپ کے بعد سمجھی گئی؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اسی لئے تو کہ وہ زندہ ہیں اور زندوں کے لیے گریہ وماتم نہیں کیا جاتا اور اگر یہ کہا جائے کہ جنگ بدر وأحد کے شہداء کفار ومشرکین کے ہاتھوں قتل ہوئے اور امام حسین اور ان کے ساتھی نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کئے گئے تو حضرت عثمان وعلی وحسن رضی اللہ عنہم بھی تو نام نہاد مسلمانوں ہی کے ہاتھوں شہید ہوئے تو ان پر گریہ وماتم کیوں نہیں کرتے؟ کیا اسلامی غزوات کی تاریخ میں کوئی ایک بھی شہادت رسول پاک کی زندگی میں یا آپ کے بعد ایسی نہ تھی کہ اس کے لئے آنسوؤں کے چند قطرے بہائے جاتے۔ کیا دور رسالت کے شہداء جن کی شہادت کی تصدیق قرآن پاک نے کردی ہے وہ بھی اس لائق نہیں تھے؟ ضرور اس لائق تھے لیکن دین اسلام میں شہادت مومن کے لئے ایک اعزاز وانعام ہے مصیبت وغم نہیں۔ اللہ پاک نے شہادت کو شہداء پر اپنا ایک عظیم انعام واحسان قرار دیا ہے: إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ

"اگر تمھیں کوئی زخم پہنچے تو یقیناً ان لوگوں کو بھی اس جیسا زخم پہنچا ہے اور یہ تو دن ہیں، ہم انھیں لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں، اور تا کہ اللہ ان لوگوں کو جان لے جو ایمان لائے اور تم میں سے بعض کو شہید بنائے۔" (آل عمران:140)

پس جب مومن کے لیے شہادت اللہ کا عطیہ اور گرانقدر بخشش ہے تو اس پر گریہ وماتم کرنے والے دشمن ہی ہو سکتے ہیں دوست نہیں ہو سکتے یا پھر پوری تاریخ اسلام سے کم از کم ایک ہی مثال پیش کی جائے کہ کسی بھی شہداء اسلام کے لئے یہ طریقہ روا رکھا گیا ہے۔ شریعت اسلامی کی رو سے تو عام اموات پر بھی تین دن سے زیادہ سوگواری جائز نہیں صرف عورت اپنے خاوند کے لیے چار ماہ دس دن تک سوگ کر سکتی ہے۔ لیکن نوحہ خوانی اور ماتم کی تو سرے سے اسلام میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: "لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُودَ, وَشَقَّ الْجُيُوبَ, وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ"

"جو شخص (کسی میت پر) اپنے رخسار پیٹے گریبان پھاڑے اور عہد جاہلیت کی سی باتیں کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (صحیح بخاری)

نیز آپ نے ارشاد فرمایا: النیاحة من عمل الجاهلية"

"نوحہ خوانی کفر و جاہلیت کے دور کا عمل ہے۔"

لہٰذا تذکرۂ شہادت حسین کے ساتھ نوحہ خوانی، ماتم وگریہ کی رسم جسے حبِّ حسین اور حبِّ اہل بیت کی علامت سمجھا جاتا ہے سراسر حسین

رضی اللہ عنہ کے نانا جان کے حکم صریح کی خلاف ورزی ہے اور شریعت اسلامی کی رو سے بدعت وضلالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کم از کم اہل سنن کو جنہیں پیروئ سنت رسول کا دعویٰ ہے اس بدعت سے باہر آجانا چاہیے۔

اول تو اس تاریخی دن میں رسول پاک اور آپ ﷺ کے آل واَصحاب سے روزہ رکھنے کے سوا کوئی دوسرا عمل یا کسی تقریب کا انعقاد ثابت نہیں۔ لیکن اس دن کی شرعی حیثیت کی مناسبت سے اگر کوئی تذکرہ موزوں اور مناسب بھی ہوسکتا ہے تو وہ جہادِ موسوی اور فرعون وآل فرعون پر ان کو غلبہ عطا کیئے جانے کا۔ نہ کہ تذکرہ شہید کربلا۔

واقعۂ کربلا اپنی جگہ کتنا ہی اہم سہی۔ اس کے تذکرے کے اور بھی مواقع ہوسکتے ہیں لیکن عاشوراء کی شرعی حیثیت سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لہٰذا یوم عاشوراء سے اس بدعت کو ختم کیا جانا چاہیے۔

واقعاتِ کربلا پر بھی ایک سرسری نظر

واقعات کربلا کو اگر اس کے پس منظر و پیش منظر میں دیکھا جائے تو اس کی ذمہ داری ایک ایسے اسلام دشمن سازشی گروہ کے سر آتی ہے جس کی اسلام دشمنی سے آج تک ملت اسلامیہ اور امت محمدیہ کو ایک امت اور ایک ملت بن کر رہنا نصیب نہ ہوسکا اور دنیا بھر کی اسلامی حکومتوں کا شیرازہ آج تک یہی سازشی گروہ بکھیرتا چلا آرہا ہے اور اگر ان واقعات کو ان کے پس منظر اور پیش منظر سے کاٹ کر دیکھا جائے کہ وہ یزید بن معاویہ کے عہد میں پیش آئے لہٰذا وہی ان تمام واقعات کا ذمہ دار بھی ہے تو اس کی نان خلفاء ثلاثہ ابوبکر و عمر و عثمان اور معاویہ اور اَصحاب رسول پر جا کر ٹوٹے گی کیونکہ یزید کے لیے بیعت خود معاویہ نے اپنی زندگی میں اپنے ارباب شوریٰ کے مشورے سے لی تھی اور معاویہ کو شام کا گورنر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مقرر کیا تھا اور حضرت عثمان نے ان کو اپنے دورِ خلافت میں اس منصب پر فائز رکھا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے ارباب شوریٰ کے مشورہ سے خلیفہ نامزد کیا تھا اور تمام مسلمانوں نے ابوبکر و عمر و عثمان کی خلافت کو تسلیم کیا تھا اور پھر حضرت علی کی شہادت کے بعد تمام صحابہ و اہل بیت اور بنوہاشم نے حضرت معاویہ کی خلافت کو بھی تسلیم کرلیا تھا۔لہٰذا درجہ بدرجہ تمام صحابہ و اہل بیت کو اس ظلم میں حصہ دار قرار دیا جائے گا۔نعوذ باللہ من ذالک اور یہی بات تو آج کے شیعانِ علی (جو دراصل شیعان علی نہیں بلکہ سبائی ہے) کھلے بندوں یہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ" معاذ اللہ" دشمنانِ اسلام ابوبکر و عمر و عثمان اور معاویہ نے" وصی رسول اللہ"" حضرت علی" سے ان کا حق خلافت چھین لیا تو ظالم اور جابر خلافتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو 60ھ میں پورے خاندان نبوت کے قتل پر منتج ہوا۔وہ اسی لئے تو ابوبکر و عمر و عثمان پر اور معاویہ پر لعن طعن اور تبرّی و تولّی کرتے ہیں اور اہل سنن" جو صحابہ اور اہل بیت دونوں سے محبت کرتے ہیں اور عقیدت رکھتے ہیں" کے اس موقف کو کھلے ہوئے تضاد اور نامعقولیت پر مبنی قرار دیتے ہیں کیونکہ دوست کا دشمن، دشمن ہوتا ہے دوست تو نہیں ہوسکتا لہٰذا علی اور اہل بیت سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے حق خلافت چھیننے والوں کو دشمن قرار دیا جائے۔علی وصی رسول اور خلیفۂ رسول بلافصل تھے ان سے پہلے ابوبکر نے اور پھر عمر نے پھر عثمان نے حق خلافت چھینا اور چوتھے نمبر پر اَصحابِ مدینہ نے انہیں خلیفہ تسلیم بھی کیا تو اہل مکہ و اہل بصرہ اور اہل شام نے ان کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا اور خود عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جنگ جمل میں باغیوں کی قیادت کی۔لہٰذا اہل سنت کے موقف کا کھلا تضاد یہ ہے کہ وہ عائشہ، طلحہ زبیر اور معاویہ کو بھی رضی اللہ عنہم کہتے ہیں اور حضرت علی کو اور امام حسین و امام حسن کو بھی رضی اللہ عنہم کہتے ہیں جبکہ مسئلہ خلافت میں ان کے درمیان جمل و صفین کی دوخونریز جنگیں ہوئیں لیکن ہم شیعانِ علی جو محبین اہل بیت ہے اور اہل بیت پر درود وسلام پڑھتے ہیں ان کے ان دشمنوں پر کھل کر لعنت کرتے ہیں۔پس ہمارا یہ موقف عدل و انصاف اور معقولیت پر مبنی ہے۔علی اور اہل بیت کا پہلو وہ اس طرح بچاتے ہیں کہ انہوں نے صدقِ دل سے نہیں بلکہ بطورِ تقیہ ان ظالموں و غاصبوں کی خلافت کو تسلیم کیا تھا۔

اہلِ سنت بھائیوں کا عقیدہ:

آپ حضرات کا کھلا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ اور اہل بیت حق پر تھے اور وہ سب کے سب جنتی ہیں۔معصوم تو صرف ذات رسالت تھی۔امتی معصوم عن الخطاء نہیں ہوسکتا۔لہٰذا اجتہادی خطاء تو ان میں سے کسی سے بھی ممکن ہے۔لیکن دانستہ گمراہی کا راستہ اختیار نہیں کرسکتے۔ہرگز رسول پاک

نے اپنے بعد کے لیے کسی صحابی یا اہل بیت کو اپنا وصی یا خلیفہ بلافصل نامزد نہیں کیا بلکہ امت کو قرآن دیا اور قرآن پاک صاف لفظوں میں خلافت و امارت کی بابت ایک رہنما اصول و ضابطہ دیتا ہے: **وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ** ”شوریٰ مسلمانوں کے اجتماعی، سیاسی معاملات ان کی شورائیت سے طے ہوتے ہیں۔“ (الشوریٰ:38)

قرآنی رہنما اصول کے مطابق ابوبکر و عمر و عثمان کی خلافت کو ان کے ادوار میں تمام صحابہ و اہل بیت نے تسلیم کیا کسی ایک فرد کو بھی ان کی خلافت تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔

قتل عثمان اور خلافت علی

حضرت علی کی خلافت، ہنگامہ قتل عثمان کے بعد ہوئی اور فوری طور پر جائے خلافت کو پُر کر دینے کی ضرورت پیش آئی تا کہ مبادا کہیں قاتلین عثمان ہی امرِ خلافت پر قبضہ نہ جمالیں اور تمام مسلمانوں پر مظالم کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے ۔اسی لئے مدینہ کے ” مہاجرین و انصار“ نے ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی اور اہل مکہ و اہل بصرہ و اہل شام کو خلیفہ کے انتخاب کے وقت مشورہ میں شامل نہ کیا جا سکا۔ پھر ان دشمنانِ اسلام سبائیوں نے جنہوں نے حضرت عثمان کو ایک طویل محاصرہ کے بعد شہید کر دیا تھا۔قصاص عثمان سے بچنے اور مسلمانوں کی صفوں میں انتشار ڈالنے کے لیے بڑھ بڑھ کر حضرت علی کے ہاتھ پر امارت کی بیعت کر لی ۔انہوں نے اپنی نعرہ بازیوں اور ہنگامہ خیزیوں سے مدینہ کے پر امن مسلمانوں کو اس قدر خوفزدہ کیا کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لیے مدینہ کی سرزمین پر سکون و قرار ناممکن ہو گیا اور وہ راتوں رات نکل کر مکہ چلی گئیں ۔حضرت علی کے دو رفیق اور مشیران خاص ” حضرت طلحہ و زبیر“ بھی مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ۔حضرت عائشہ نے اپنی مکہ کی تقریر میں ان تمام حالات و واقعات کا صاف صاف تذکرہ کیا جن میں مختلف صحابہ کرام اور خود ان کو مدینہ ترک کرنا پڑا ۔انہوں نے سبائی شورش پسندوں کی خوف و دہشت پھیلانے کی تمام کوششوں کو بے نقاب کیا اب شکوک و شبہات کا دلوں میں پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ یہ شبہات حضرت علی سے متعلق نہ تھے ۔ان کی صالحیت و صلاحیت پر مسلمانوں کو پورا اعتماد تھا بلکہ یہ ان سبائی مبایعین کی جانب سے تھے کہ آیا انہوں نے دل سے علی کی بیعت کو قبول کیا ہے یا صرف تخریب کاری اور عام مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانی کے مقصد سے بیعت کی ہے کیونکہ وہ قتل عثمان اور بیعت علی کے بعد بھی اپنی تخریبی کارروائیوں میں مصروف اور خوف و دہشت کی فضاء عام کرنے میں مصروف تھے اور بظاہر ایسا نظر آ رہا تھا کہ انہوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے بعد علی رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے نرغے میں لے لیا ہے اور وہ ان کی منظم قوت کے سامنے بالکل بے بس اور مجبور و محصور ہو کر رہ گئے .قاتلین عثمان کا سرگروہ مالک اشتر ننگی تلوار کے سایہ میں ایک ایک صحابی رسول کو طلب کر کے جبراً علی کی بیعت کا مطالبہ کر رہا تھا۔گو نام کے لیے یہ علی کی حمایت تھی لیکن درپردہ ایک خطرناک قسم کی تخریب کاری تھی اور اس کی انتہا یہ تھی کہ طلحہ اور زبیر اور عبداللہ بن عمر جیسے علی کے رفیقان خاص کو بیعت کے لیے طلب کیا گیا۔طلحہ اور زبیر سے مالک اشتر نے کہا کہ فوراً امام کی بیعت کرو ورنہ تلوار کی ایک ہی ضرب سے سر کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں گے. چنانچہ دونوں حضرات نے بیعت کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا لیکن عمر فاروق کے بیٹے حضرت عبداللہ اڑ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ابھی تو بہت سے مسلمانوں کی بیعت ہونا باقی ہے جب وہ بیعت کر لیں گے تو میں بھی کر لوں گا.مالک اشتر نے تلوار اٹھانی چاہی تو حضرت علی نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ شخص طبعاً ضدی ہے اس طرح رعب سے بیعت کرنے والا نہیں ۔طلحہ اور زبیر نے مکہ جا کر بیعت توڑ دی کیونکہ وہ برضاء و رغبت نہ تھی بلکہ جبراً لی گئی تھی ۔

قصاصِ عثمان کا مطالبہ

اہل مکہ و اہل بصرہ نے مدینہ کی صورتحال کو طلحہ و زبیر اور ام المومنین عائشہ صدیقہ کی زبانی سنا تو وہ شدید انتشار، ذہنی و اضطراب قلبی میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف حضرت علی کی خلافت پر انہیں پورا اعتماد تھا تو دوسری طرف سبائیوں کی منظم شورش اور تخریب کاری سے سخت پریشانی اور ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔ وہ اس اندیشے میں بالکل حق بجانب تھے کہ اگر قوت اور طاقت علی کے ہاتھ میں ہے تو قصاصِ عثمان بھی لے لیں گے اور حالات کو بھی معمول پر لے آئیں گے۔ لیکن اگر تمام تر قوت ان قاتلین عثمان (سبائیوں) کے منظم گروہ کے ہاتھوں میں ہے تو ان کی شورش سے نہ تو خود علی محفوظ رہ سکیں گے اور نہ ان کے مبایعین صحابہ و اہل بیت۔ اور عثمان کے بعد خاندان عثمان کا انجام تو کسی صورت عثمان کے انجام سے مختلف نہ ہو گا۔ لہذا صورت حال کی وضاحت کے لئے ان کے نزدیک اس کے سوا کوئی اور ممکن صورت ہی نہ تھی کہ علی کے ہاتھ پر اپنی بیعت کو قصاصِ عثمان پر موقوف کر دیں کیونکہ حضرت علی کے ہاتھ پر ایک جم غفیر بیعت کر چکا تھا اور اگر یہ بیعت خلوص نیت اور سمع وطاعت کے جذبہ کے تحت تھی تو یہ امر چنداں دشوار اور دقت طلب نہ تھا کہ ان گنتی کے 7، 5 نفر سے" جو براہ راست قتل عثمان میں ملوث تھے" قصاص لے لیا جاتا اور اگر قاتلین عثمان کی نیت کچھ اور تھی اور وہ صرف حضرت علی کو مسلمانوں کے سامنے لا کر اور ان کو آڑ بنا کر کوئی نیا خونی ڈرامہ کرنا چاہتے تھے تو حضرت علی ان سے قصاص لینے پر کسی صورت قابل نہیں ہو سکتے تھے اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے قصاصِ عثمان کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ صرف مطالبۂ قصاص نہ تھا بلکہ سبائیوں کی نیت و ارادوں کو جاننے اور پرکھنے کے لیے ایک جانچ بھی تھی۔ حضرت علی بھی بلوائیوں کی شورش اور ان کی بدنیتی اور غلط ارادوں سے بالکل بے خبر نہ تھے لہذا وہ چاہتے تھے کہ جب اس پر آشوب دور میں خلافت قبول کرنے کی ذمہ داری ان کے سر ڈالی گئی ہے تو جس طرح ان قاتلین عثمان نے اپنی نیک نیتی اور خلوص ظاہر کر کے علی کی بیعت کر لی ہے اسی صورت اہل مکہ و اہل بصرہ و اہل شام بھی بیعت کر لیں اگر بلوائیوں کی طرف سے کوئی نئی شورش بپا ہو تو صحابہ کی منظم قوت سے اسے کچلا جا سکے لیکن ایسی نازک صورتحال میں مسلمانوں کے لیے کوئی قطعی فیصلہ آسان نہ تھا۔ ظاہری صورت حال جو طلحہ، زبیر اور عائشہ صدیقہ کی زبانی سنی گئی تھی انتہائی پریشان کن تھی۔ بلوائی اپنی منظم قوت اور بالادستی کا کھلا مظاہرہ کر رہے تھے اور مسلمانوں کو بری طرح ہراساں کر رہے تھے۔

جب اہل مکہ اور اہل بصرہ نے بیعت سے قبل قصاصِ عثمان کا مطالبہ کر دیا تو حضرت علی کے لیے انتہائی پریشان کن صورت حال پیدا ہو گئی ایک طرف ان کی اپنی مجبوری بھی تھی کہ مطالبہ بیعت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے اور دوسری طرف اہل مکہ و اہل بصرہ کے اندر ہیجانی و اضطرابی کیفیت کو بھی وہ پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

حضرت علی نے خود اپنی رضا اور رغبت سے تو امارت سنبھالی نہ تھی انہوں نے تو مدینہ کے اصحابِ رسول، مہاجرین و انصار کے اصرار پر یہ ذمہ داری قبول کی تھی کہ اسلام میں جائے خلافت کو خالی چھوڑنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی گوشہ امیر و امام کی سمع وطاعت سے خالی نہیں رہنا چاہیے۔ پھر اس بات کا بھی شدید امکان کہ یہی قاتلین عثمان خلیفۂ سوم کو قتل کرنے کے بعد اپنے ہی میں سے کسی کو امیر و امام بنا کر دارالخلافہ (مدینہ) پر قبضہ نہ کر لیں۔ ایک مسلح جم غفیر کی موجودگی میں اس بات کا بھی تو موقع نہ تھا کہ اہل شام و اہل مکہ و بصرہ

کو انتخاب خلافت کی دعوت دی جاتی۔خود اہل مدینہ بلوائیوں کی طاقت کے سامنے مجبور تھے اسی لیے وہ اپنے خلیفۂ عثمان کی طرف سے جنگ بھی نہ کرسکے۔اسی نازک صورت حال کے پیش نظر علی نے امارت کو قبول کرلیا تھا ورنہ وہ سمجھتے تھے کہ حضرت عثمان کے اس طرح مظلومانہ قتل کے بعد بلا شورائیتِ عامہ ان کی امارت مشکوک اور اختلاف سے محفوظ نہ رہ سکے گی اور اسی لیے وہ قتل عثمان کے وقت باہر چلے گئے تھے لیکن جب اس نازک اور پرآشوب دور میں خلافت کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی اور انہوں نے اسلام اور اہل اسلام کی مصلحتوں کے پیش نظر اسے قبول کرلیا تو اب مسلمانوں سے سمع وطاعت کی بیعت لینا ان کے ابتدائی اور اہم ترین منصبی فرائض میں سے تھا۔دوسری طرف مدینہ کی خبروں سے دور دراز علاقوں کے مسلمانوں کے دل میں جو خدشات پیدا ہورہے تھے وہ بالکل قدرتی تھے۔یعنی یہ کہ جب حضرت علی اور تمام اہل مدینہ نے ان ہزاروں مسلح بلوائیوں سے خلیفہ سوم کو نہ بچا سکے اور ان کے مقابلہ میں خود کو مغلوب وکمزور پایا تو اب حضرت علی کو انہیں اہل مدینہ کی بیعت سے بلوائیوں پر غلبہ کس طرح حاصل ہوسکتا ہے۔غلبہ تو اسی صورت حاصل ہوسکتا ہے جب قتل عثمان کے بعد بلوائی علی کی بیعت سمع وطاعت پر صدق دل سے آمادہ ہوگئے ہوں اور اس کی آزمائش کا واحد راستہ قصاصِ عثمان کا مطالبہ ہوسکتا تھا ورنہ قرآن کے حکم "خذوا حذرکم" دشمن سے اپنی احتیاط اور چوکسی کو لازم پکڑو۔" کے مطابق دور دراز کے مسلمانوں کے لیے یہ کسی طرح لائق ومناسب ہی نہ تھا کہ بلا سمجھے بوجھے بیعت امام کے عنوان سے خود کو بلوائیوں کی مسلح قوت کے حوالہ کردیتے۔خود حضرت علی کو اس مطالبہ کی صحت اور اس کے پس منظر کی معقولیت کا پوری طرح احساس بھی تھا۔لیکن وہ سر دست اس پر قادر نہ تھے کہ عثمان کے قاتلوں سے قصاص دلوا سکتے۔یہی مطالبہ معاویہ کا بھی تھا کہ علی قاتلین عثمان سے قصاص دلوا دیں تو اہل شام ان کی بیعت کو قبول کرلیں۔معاویہ کا یہ مطالبہ حضرت علی نے چار ماہ کی مہلت کے ساتھ تسلیم بھی کرلیا تھا۔لیکن چار ماہ بعد جب حضرت علی نے سمجھا بجھا کر قاتلوں کو قصاص کے لیے معاویہ کے حوالے کرنا چاہا تو بیس ہزار سبائی شمشیر بکف روبرو مظاہرہ کرنے لگے" ہم سب قاتلین عثمان ہیں" اگر قاتلین عثمان کو معاویہ کے حوالے کرنا ہے تو ہم سب کو اس کے حوالے کردو۔اس مظاہرے سے حضرت علی دم بخود رہ گئے اور اچھی طرح سمجھ لیا کہ بلا مکہ وبصرہ واہل شام کی بیعت کے وہ قصاص عثمان پر قادر نہیں ہوسکتے۔دوسری طرف قاتلین عثمان انہیں اس بات پر مجبور کررہے تھے کہ آپ ایسے لوگوں کے مطالبۂ قصاص پر کان نہ دھریں اور اگر وہ بلا قید وشرط آپ کی بیعت قبول نہ کریں تو آپ بہ نوک شمشیر ان سے بیعت کا مطالبہ کریں اور پہلے بیعت معاویہ اور اہلِ شام سے بیعت لی جائے اس لیے کہ عثمان کے ولی اقرب معاویہ ہی تھے اگر وہ بلا قید وشرط بیعت کرلیتے یا مطالبۂ قصاص ترک کردیتے تو اہل مکہ واہل شام بھی بلا قید وشرط بیعت کرلیتے۔لیکن معاویہ کس طرح قصاصِ عثمان سے دستبردار ہوسکتے تھے اگر معاملہ تنہا ان کی اپنی بیعت کا ہوتا تو یہ ممکن بھی تھا کہ وہ ایسا کرتے لیکن ان بلوائیوں نے تو دیدہ ودانستہ صورتحال کو اس درجہ قابو سے باہر کردیا تھا اور اہل شام کے جذباتِ انتقام کو اس قدر برانگیختہ کردیا تھا کہ ایسا کرنا خود معاویہ کے قدرت واختیار سے باہر تھا۔جس طرح قاتلوں سے قصاص لینا علی کے اختیار سے باہر تھا۔بھلا یہ خوں آلود قمیص عثمان اور بی بی نائلہ کا کٹا ہوا ہاتھ مدینہ سے شام تک کس طرح پہنچ گیا؟ کہ اسے جب اہل شام نے دیکھا تو کہرام مچ گیا؟ وہاں کے علماء اور مشائخ نے قسم کھائی کہ جب تک خلیفہ مظلوم کے قاتلوں سے انتقام نہ لے لیں گے نہ راتوں کو بستر پر سوئیں گے نہ زینت اور خوشبو کا استعمال کریں گے۔مظلوم خلیفہ کی تجہیز وتکفین کو حضرت علی کی خلافت میں ان کے تحت امر ہوئی تھی پھر خلیفہ کی خون آلود قمیص اور بیوی نائلہ کا کٹا

ہوا ہاتھ کس نے اور کس مصلحت کے پیشِ نظر شام پہنچایا تھا؟ کیا کوئی شام سے مدینہ آیا تھا جو اپنے ساتھ قمیص عثمان اور نائلہ کا ہاتھ لے گیا؟ نہیں بلکہ یہ انہیں ظالم سبائیوں کی شر انگیزی تھی جو ایک طرف حضرت علی کو معاویہ و اہل شام سے بہ نوک شمشیر بیعت لینے پر آمادہ کر رہے تھے تو دوسری طرف اہل شام کو قصاصِ عثمان کے لیے بھڑکا رہے تھے۔

جنگِ جمل

اب مکہ و بصرہ چونکہ شام کی بہ نسبت مدینہ سے زیادہ قریب تھے اور اندیشہ تھا کہ اگر شام کی طرف پہلے پیش قدمی کی گئی تو وہ معرکہ زیادہ سخت اور خونریز ہوگا اور اس دوران اس بات کا بھی احتمال تھا کہ اہل مکہ و اہل بصرہ کہیں دارالخلافہ مدینہ پر قبضہ نہ کرلیں۔ لہٰذا مناسب یہی سمجھا گیا کہ شام سے پہلے بصرہ کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ حضرت علی مسلمانوں کے باہمی ٹکراؤ کے تصور سے بڑے پریشان تھے۔ حضرت ام المومنین رسول خدا ﷺ کی انتہائی محبوب اور قابل اعتماد بیوی تھیں وہ بھی بصرہ پہنچ چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ صحابہؓ کرام ناموس رسالت کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے سے دریغ نہیں کرسکتے تھے۔ خدانخواستہ اگر ام المومنین اس معرکے میں قتل ہوگئی ہوتیں یا شدید زخمی ہوجاتیں تو مسلمانوں کے جذبات کو روکے تھامے رہنا ممکن نہ ہوسکتا۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر حضرت علی نے اپنا ایک قابل اعتماد قاصد حضرت عائشہ اور حضرت طلحہ و زبیر کی خدمت میں روانہ کردیا، اس نے پہلے مائی عائشہ کی خدمت میں حاضری دی اور دریافت کیا کہ" امی جان آپ یہاں کس مقصد سے تشریف فرما ہوئیں؟ مائی جان نے جواب دیا: بیٹے مسلمانوں میں بیچ بچاؤ اور اصلاح کی غرض سے حاضر ہوئی ہوں۔ پھر قاصد نے طلحہ اور زبیر سے ملاقات کی اور دونوں حضرات کو اس بات پر رضامند کرلیا کہ وہ سردست مطالبہؑ قصاص عثمان کو ترک کردیں گے اور حضرت علی سے بات چیت کرکے بیعت قبول کرلیں گے۔ اس وقت حضرت علی کوفہ پہنچ چکے تھے۔ اس دوران عبداللہ بن سبا یہودی جو بظاہر اسلام قبول کرچکا تھا اور جس نے سرزمین عرب کے تمام صوبوں (صوبہ شام کے علاوہ) میں اسلامی خلافت کے نظام کو درہم برہم کرنے اور مسلمانوں کو آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ختم کرنے کا منصوبہ پھیلا دیا تھا۔ بذات خود کوفہ میں موجود تھا اس نے اپنے گروہ کے سرکردہ لوگوں کی ایک خفیہ میٹنگ کی اور کہا کہ اگر طلحہ اور زبیر اور علی کے حامیوں (شیعانِ علی) کے مابین یہ نزاع ختم ہوگئی اور ان کی آپس میں صلح طے ہوگئی تو ہماری خیر نہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ (شیعان علی) سے ہم اپنی رفاقت اور دوستی پوری طرح بنائے رکھے اور بظاہر کسی امر میں ان کی کھل کر مخالفت نہ کریں لیکن کل جب علی اور ان کے ساتھی بصرہ صلح کی بات چیت کرنے جائیں تو رات کے پچھلے پہر ہم لوگ بصرہ کی سرحد پر ایک زوردار حملہ کردیں اور شور مچائیں کہ بصرہ کی فوج نے کوفہ کے اندر داخل ہوکر ہم پر اچانک حملہ کردیا جس کو ہم نے بالکل پسپا کردیا اور حملہ آوروں کو ان کی سرحد میں واپس دھکیل دیا اور سرحد ہی سے ہمارا ایک شخص جاکر علی کی مجلس میں ان سے کچھ فاصلہ پر جا بیٹھے اور جب وہ شوروہنگامہ سن کر دریافت کریں کہ کیا معاملہ ہے تو وہ ان کو ہمارے منصوبے کے مطابق آگاہی دے کہ بصرہ کی فوج نے کوفہ کے اندر داخل ہوکر ہم پر اچانک حملہ کردیا جسے ہم نے سرحد تک پسپا کردیا اور حملہ آوروں کو سرحد کے اندر دھکیل دیا اور جب بصرہ کی سرحدی چوکی والوں نے ہم پر پلٹ کر دوبارہ جوابی حملہ کیا تو ہمارے ساتھی رات کی تاریکی میں منتشر ہوگئے اور مجھے واپس جانے کا موقع اور راستہ نہ مل سکا تو میں یہاں آپ کی مجلس میں آبیٹھا اور جب طلحہ اور زبیر کو اس شوروہنگامہ کی آواز سنائی دے گی اور ان سے لوگ کہیں گے کہ کوفہ والوں نے بلا کسی اشتعال کے ہم پر حملہ کردیا ہے تو علی اور طلحہ و زبیر اور ان کے حامیوں کے مابین اعتماد خود بخود ختم ہوجائے گا اور جنگ کی آگ بھڑک اٹھے گی اور جو جس کا حامی اور ساتھی ہے اس کی حمایت میں لڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا اور صلح کی بات چیت اور اس کا امکان ختم ہوجائے گا۔

حضرت علی قاصد کے اس پیغام سے بہت خوش اور مطمئن ہوئے تھے اور انہوں نے اعلان کیا تھا کہ کل ہمارے ساتھ مصالحت کی

بات چیت کے سلسلے میں ایسے اشخاص ہرگز نہیں جائیں گے جو کم عقل جذباتی اور ہنگامہ پسند ہیں ۔انہوں نے صلح کی بات چیت میں شرکت کے لیے اپنے اعتماد کے لوگوں کو چن لیا تھا ان کے اسی اعلان سے سبائیوں کا ماتھا ٹھنکا تھا کہ مصالحت اگر واقع ہوئی تو ہماری خیر نہیں ۔علی بہر حال خلیفہ مظلوم کا قصاص لے کر رہیں گے اور پھر ہماری قیل وقال کوئی سننے والا نہ ہوگا.اس لئے انہوں نے عین اس وقت کہ جب بات چیت بڑے خوشگوار ماحول میں جاری تھی اور دونوں فریق سفیر کے ذریعے صلح کی بات چیت کو آگے بڑھاتے جارہے تھے اور جب اس بات کے نمایاں آثار پائے جارہے تھے کہ ام المومنین عائشہ اور طلحہ وزبیر اور اہل بصرہ کے قصاصِ عثمان سے قبل علی کی بیعت پر رضامند ہوجائیں گے ۔اچانک رات کے پچھلے پہر شور اور ہنگامہ اور جنگی نعروں کی آواز گونجی ۔طلحہ اور زبیر نے دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ ابھی کوفہ کی فوج نے بصرہ کی سرحد پر حملہ کر دیا ہے تو انہوں نے انا للہ کہا اور کہا کہ علی مسلمانوں کے مابین خونریزی کرا کر ہی دم لیں گے ۔اسی طرح جب علی نے یہ شور وہنگامہ سنا تو دریافت کیا۔کیا بات ہے ۔پھر جب اس شخص نے جسے ایک سازش کے تحت ان کے پاس بھیجا گیا تھا انہیں خبر دی کہ بصرہ کی فوج نے رات کو اچانک حملہ کر دیا تو حضرت علی نے انا للہ کہا اور کہا کہ طلحہ اور زبیر مسلمانوں میں خونریزی کرا کے ہی دم لیں گے ۔ چنانچہ اسی وقت ہر دو فریقین کے مابین انتہائی خونریز جنگ بھڑک اٹھی ۔حضرت عائشہ ہودج میں بیٹھی اونٹ پر سوار تھیں اور ان کے اونٹ کے گرد مسلمانوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے ۔دشمنان اسلام کو کبار صحابہ کو چن چن کر قتل کرنے کا موقع مل گیا۔انہوں نے خاص طور پر ایسے ہی افراد کو نشانہ بنایا جن کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ رسول پاک کو ان سے خاص وابستگی تھی یا آپ نے انہیں دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی ہے ۔ چنانچہ طلحہ اور زبیر بھی شہید کر دیئے گئے اور 10 ہزار مسلمان جس میں بڑے بڑے جلیل القدر اصحاب رسول تھے اس جنگ میں کام آگئے ۔لیکن جنگ کی شدت کم ہوتی نظر نہیں آرہی تھی ام المومنین عائشہ نے بھی گویا تہیہ کرلیا تھا کہ وہ بھی خلیفۂ مظلوم کے قاتلوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر کے ہی دم لیں گی ۔لہٰذا وہ میدان جنگ میں ڈٹی رہیں اور اصحاب رسول پروانوں کی طرح ان کے ہودج کے قریب اپنی جانیں قربان کرتے رہے ۔حضرت علی نے حالات کی سنگینی کا اندازہ کرلیا۔ نیز انہوں نے محسوس کیا کہ اگر ام المومنین درمیان سے علیحدہ نہ ہوئیں تو صورت حال اور ابتر ہو جائے گی.لہٰذا انہوں نے اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ جا کر ام المومنین کے اونٹ کا داہنا قدم کاٹ دے چنانچہ جب قدم کاٹ دیا گیا اور اونٹ لڑکھڑا کر بیٹھ گیا تو ہودج ایک جانب جھک کر زمین پر ٹک گیا۔فوراً ہودج سنبھالا گیا اور علی نے پہنچ کر معذرت کے انداز میں پوچھا کہ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟ پھر کہا مائی جان میں خدا کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ آپ میدان جنگ سے باہر چلیں یہ آپ کی جگہ نہیں ۔مجھے مسلمانوں نے خلافت کی ذمہ داری سونپی ہے لہٰذا مجھے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے دیں آپ کے لیے میدان جنگ سے باہر میں نے ایک بالکل محفوظ مقام کا انتظام کرلیا ہے آپ وہیں قیام کریں. چنانچہ ام المومنین حضرت علی کے سمجھانے بجھانے سے میدان جنگ سے ہٹ گئیں .دشمنان اسلام نے ان کے ہودج پر اتنے تیر برسائے تھے کہ پورا ہودج ایک بڑی ساہی معلوم ہوتا تھا جس نے اپنے جسم کے کانٹے پھیلا لئے ہوں ۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ کی لاش دیکھ کر رو پڑے اور ان کے ہاتھوں کا بوسہ لے لے کر فرماتے:" ابا جان دیکھیے میں نے آپ کو روکا تھا کہ بصرہ پر لشکر کشی نہ کیجئے ۔لیجئے یہ طلحہ کی لاش ہے جن کو آنحضرت ﷺ نے جنتی اور ان کے قاتل کو جہنمی قرار دیا ہے.حضرت

علی پر بھی رقت طاری ہوگئی اور فرمایا کہ کاش کہ میں آج سے بیس برس پہلے مر چکا ہوتا.اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔مقتولین کی نماز جنازہ پڑھی گئی اوران کی تدفین ہوئی۔اہل بصرہ نے شکست کھا کر علی کی بیعت کرلی۔

جنگِ صفین

اس کے بعد اہلِ شام سے جنگ ہونی تھی۔حضرت علی حتی الامکان اس جنگ سے بھی بچنا چاہتے تھے.ایک وفد مصالحت کے لیے معاویہ کے پاس بھیج دیا اس وفد کی قیادت سوء اتفاق سے ایک انتہائی سخت گو اور جنگ پسند فرد کے حصہ میں آئی۔اس نے مصالحانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے نہایت تیز وتند اور دھمکی آمیز لہجہ میں معاویہ سے گفتگو کی۔جس پر معاویہ کو سخت غصہ آیا اور کہا: تو صلح کی بات کرنے نہیں بلکہ مجھے جنگ کی دھمکی دینے آیا ہے اور ہم جنگ سے ڈرنے والے نہیں۔ہماری تلواریں قاتلین عثمان کی گردن تک پہنچ کر رہیں گی.اس نے واپس ہو کر علی کو معاویہ کے خلاف بھڑکایا کہ وہ آپ کو قاتلِ عثمان سمجھتے ہیں اور آپ سے ان کے خون کا انتقام لینا چاہتے ہیں.حضرت علی کو معاویہ کی یہ بات سخت ناپسند ہوئی۔انھوں نے شام کی طرف فوج کشی کی۔معاویہ کی فوج بھی آگے بڑھی۔صفین کے مقام پر دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ شروع ہوئی۔ابتدائی دو تین دنوں میں معاویہ کا پلہ بھاری رہا پھر اس کے بعد ان کی فوج میں پسپائی کے آثار ظاہر ہوئے۔اس جنگ میں دونوں طرف سے 90 ہزار مسلمان مارے گئے۔ایسا لگتا تھا کہ اسلام کا پورا قافلہ ہی اب دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔

معاویہ کی طرف سے نیزوں پر قرآن اٹھا کر آواز دی گئی کہ اللہ کی آخری کتاب ہمارے درمیان موجود ہے اسے حکم مان کر مسلمان آپس میں صلح کرلیں اور قتال سے باز آجائیں۔علی نے کہا: بھائیو! یہ معاویہ کی چال ہے۔اب جنگ روکنے سے کیا حاصل۔جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔تھوڑی دیر میں میدان جنگ میں فیصلہ ہونے والا ہے.لہٰذا دھوکہ نہ کھاؤ اور جنگ جاری رکھو۔

سبائیوں نے سوچا کہ اگر میدان جنگ میں فیصلہ ہوگیا تو وہ معاویہ کی شکست اور علی کی فتح کا فیصلہ ہوگا۔اہل بصرہ کی طرح اہل شام بھی شکست کھا کر علی کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے اور پھر علی مسلمانوں کو اپنے جھنڈے تلے منظم ومتحد کر کے تخریبی عناصر کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوں گے اور اب اتنی بڑی دو خونریز جنگوں کے بعد سبائیوں کی سرکوبی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے گا.لہٰذا عراق والوں نے حضرت علی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔انہوں نے کہا: اے علی قرآن کی دعوت کو رد نہیں کیا جاسکتا، اگر تم نے فوراً جنگ بندی قبول نہ کی تو ہم تمہاری مشکیں کس کر، نیزے کی نوک پر معاویہ کی طرف دھکیل دیں گے، یا پھر تم کو اسی طرح قتل کر دیں گے جیسے ہم نے عثمان کو قتل کیا ہے.

حضرت علی نے مالک اشتر کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ جنگ روک دے۔لیکن اس نے قاصد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فوج کو للکارا اور قاصد سے کہا کہ یہ وہ وقت نہیں ہے جس میں جنگ روکی جائے۔فیصلہ ہونے ہی والا ہے۔بلوائیوں نے مالک اشتر کی للکار سن کر پھر علی پر اپنی برہمی کا اظہار کیا اور کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے ہماری فرمائش پر قاصد کو بھیج دیا لیکن مالک اشتر کو درپردہ ہدایت کر دی کہ وہ جنگ کو جاری رکھے۔دیکھئے اگر جنگ فوراً بند نہیں ہوتی تو ہم آپ کو پکڑ کر معاویہ کے حوالے کر دیں گے یا بری طرح قتل کر دیں گے۔حضرت علی نے قاصد کو دوبارہ ڈانٹ کر کہا کہ جاؤ مالک اشتر کو کہو فوراً جنگ روک دے اور واپس آجائے کیونکہ اب فتنہ خود ہمارے گھر میں برپا ہو چکا ہے۔جنگ اپنے انجام کو پہنچ کر بھی بے نتیجہ رہی اور دشوار و پیچیدہ صورتحال جو جنگ سے قبل تھی ایک لاکھ مسلمانوں کے قتل کے بعد بھی جوں کی توں قائم و باقی رہی۔

حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ بالکل دل برداشتہ ہو چکے تھے بلکہ ان دشمنان اسلام کی ناپاک سازشوں کی وجہ سے ان کی کمر ہمت ٹوٹ چکی تھی۔کبھی حسرت سے وہ معاویہ کی قلیل لیکن وفادار فوج کا تذکرہ کرتے اور ساتھ ہی اپنے بے وفا سبائی مبایعین پر کف افسوس ملتے اور فرماتے کہ اگر معاویہ جیسی وفادار فوج مجھے میسر آتی تو میں بہت ہی قلیل تعداد کے ساتھ غالب آجاتا اور کبھی اس بات کی تمنا کرتے کہ کب میری زندگی میں وہ مبارک دن آئے گا کہ مجھے خلافت کے اس ناقابل برداشت بوجھ سے نجات میسر ہوں گی کیونکہ اس نازک اور پر آشوب دور میں وہ بار خلافت اٹھانے ہی پر رضامند نہ ہو رہے تھے اور لوگوں کے زور دینے سے ہوئے بھی تو فتنہ سبائیت نے انہیں بالکل مجبور کر دیا، محصور اور بے دست و پا کر کے رکھ دیا اور پانچ سالہ دور خلافت میں اسلامی فتوحات تو دور کی بات تھی داخلی انتشار اور خانہ جنگی ہی سے فرصت نہ مل سکی۔صلح کی تمام کوششیں ایک ایک کر کے ناکام بنائی گئیں اور ان کے نہ چاہنے کے باوجود ہر موقع پر جنگ کی آگ بھڑکائی گئی اور بے دریغ مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔جب جنگ نہ چاہی تو جنگ پر مجبور کئے گئے اور جنگ کی صعوبت جھیل کر جیتنے کی حیثیت میں ہوئے تو جنگ بندی پر مجبور کر دیئے گئے اور ایسا لگتا ہے کہ طلحہ وزبیر اور عائشہ صدیقہ کے چشم دید بیانِ واقعات سے اہل مکہ واہل بصرہ واہل شام سبائیوں کے بیعت کی اس حقیقت کو پہلے ہی اچھی طرح سمجھ چکے تھے اور جان چکے تھے کہ عثمان کے بعد علی بھی سبائیوں کے نرغے میں آچکے ہیں اور جلد یا بدیر ان کا بھی وہی انجام ہونے والا ہے جو خلیفہ سوم کا ہوا۔ان کا یہ اندیشہ اپنی جگہ بالکل درست ثابت ہوا۔سبائیہ مسلمان نہ تھے بلکہ یہود کی سازشی ایجنسی تھی جس کا کام ہی اسلام کے نظام خلافت کو درہم برہم کرنا، ایک دوسرے سے ٹکرانا تھا۔وہ نہ اہل بیت نہ بنو ہاشم کے دوست تھے اور نہ بنو امیہ کے۔دونوں ہی کے غلبہ اور سرداری کو یہود و نصاریٰ کے لیے مستقل خطرہ سمجھتے تھے۔حضرت عمر کے دور خلافت میں یہود و نصاریٰ کو انتہائی ذلت آمیز شکست سے دو چار ہونا پڑا تھا اور ایسا نظر آ رہا تھا کہ دوسرا کوئی اور فاروق پیدا ہو گیا تو پوری دنیا سے کفر و باطل کا نام ونشان مٹ جائے گا۔لہٰذا قوم یہود کو جس کی اسلام دشمنی تمام کافر و مشرک اقوام سے بڑھ چڑھ کر ہے۔اپنی بقا صرف نظام اسلام کو درہم برہم کرنے اور خلفاء و اُمراء کو ایک ایک کر کے قتل کرنے اور اہل اسلام کے مابین طبقاتی نفرت و عداوت پھیلانے ہی میں نظر آئی اور انہوں نے خلافت عثمان کی ابتدا ہی سے اپنی منظم سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ جن کی مدت خلافت صرف دو سال پانچ ماہ تھی" انھیں کو اپنے بستر پر طبعی موت نصیب ہو سکی۔ان کے بعد عمر، عثمان، وعلی وحسن وحسین اور ان کے ساتھ پورا خاندان نبوت چن چن کر قتل کر دیا گیا۔قاتل گو بظاہر مسلمان تھے مگر ہرگز مسلمان نہ تھے۔مسلمان مسلمان کا عمداً قاتل نہیں ہو سکتا اور ان تمام خلفاء و امراء و ائمہ کا قاتل تاریخ کے گہرے اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کی روشنی میں ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں نظر آتا ہے۔گو تاریخی اخبار و آثار کی بھی ایک حیثیت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن ان اخبار کا درجہ ایک مومن و مسلم کی نظر میں ان اخبار و آثار کے بعد ہے جو قرآن وسنت میں موجود ہے. مثلاً اگر قرآن پاک ہمیں یہ خبر دیتا ہے کہ محمد رسول اللہ اور وہ لوگ جو بحالتِ ایمان ان کے ساتھی بنے وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحمدل ہیں، اور یہ کہ اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اور یہ کہ اللہ انھیں اپنی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی، وغیر ذالک تو کیا ممکن ہے کہ قرآن میں دی ہوئی یہ خبریں آئندہ چل کر غلط ثابت ہوں اور جن کی سرشت اور فطرت قرآن نے یہ بیان فرمائی ہو کہ کافروں پر سخت اور اہل ایمان پر انتہائی نرم ہیں۔وہی قوم آئندہ چند سالوں بعد آپس میں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی اور

دشمن بن جائے اور جن کے لئے اللہ نے اپنی رضا اور جنت کی بشارت اسی دنیا میں دے دی ان کا انجام اس کی رضا کے بجائے اس کی ناراضی و بے زاری اور جنت کے بجائے جہنم ٹھہرے۔ ایسی صورت میں تو نعوذ باللہ علم الٰہی ہی غلط ہو جائے گا۔ لیکن سبائی لعینوں کو قرآن کریم اور اس کی خبروں سے کیا واسطہ وہ تو اسلام و اخلاق و دین ہر چیز کے دشمن تھے۔ انھوں نے ایک طرف تو موضوع (جھوٹی و من گھڑت) روایات شیعان علی میں پھیلائیں تو دوسری طرف ان کی کتب عقائد میں مسئلہ "بداْ" داخل کر دیا۔ تاکہ اہل ایمان صحابہ کے متعلق قرآنی اخبارات سے مسلمانوں کی توجہ کو پھیرا جا سکے۔

"بَدَاْ" کے معنی "ظھر" ہیں یعنی "ظھر فی علم اللہ مالم یکن فی علمہ قبل" اللہ کے علم میں وہ بات آئی جو حادثہ کے ظہور سے قبل نہ تھی، لہٰذا اصحابہ اور قرآن کی حفاظت کے متعلق جو کچھ اس نے قبل از وقت خبر دی تھی کہ صحابہ، مہاجرین و انصار سب کے سب اللہ کی رضا اور جنت کے سزاوار ہوئے اور یہ کہ قرآن کریم کی ہم ہمیشہ حفاظت کریں گے نیز یہ کہ اس میں باطل کی آزمائش نہیں ہو سکتی اور یہ خدائے عزیز و حمید کی تنزیل ہے یہ ساری باتیں آئندہ حالات و واقعات کی روشنی میں گویا نعوذ باللہ غلط اور بے بنیاد ثابت ہوئیں اس لئے کہ سبائیت کے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ آئندہ پیش آنے والے واقعات و حوادثات کو ان کے پیش آنے سے قبل نہیں جانتا۔ اسی کو مسئلہ "بَدَاْ" کہتے ہیں۔ جو شیعہ کتب عقائد میں اسی طرح موجود ہے۔

چنانچہ سبائیت زدہ شیعیت موجودہ تیس پاروں والے قرآن کو بھی قرآن منزل نہیں بلکہ " بیاضِ عثمانی " قرار دیتی ہے۔ کتب شیعہ میں سبائیوں نے یہ روایت بھی درج کر دی کہ وہ قرآن جو محمد رسول ﷺ پر نازل ہوا چالیس پاروں پر مشتمل تھا۔ خدا کے دشمنوں ابوبکر و عمر و عثمان نے اس میں دس پارے حذف کر دئے جو علی کی فضیلت میں تھے۔ اصل قرآن کا ایک نسخہ اہل بیت کے یہاں محفوظ تھا جس کو حضرت امام حسن عسکری " جو آئندہ مہدیٔ زماں بن کر ظاہر ہوں گے۔ " لے کر غار سرمد میں روپوش ہو گئے۔ وہ قرآن لے کر اس وقت ظاہر ہوں گے جب 313 شیعہ ایماندار دنیا میں موجود ہوں گے گویا اب تک دنیا میں اتنی تعداد میں ایماندار شیعہ بھی وجود پذیر نہ ہو سکے۔ دراصل یہ اور ایسی واہی روایات شیعیت پر بھی ایک ضرب کاری ہیں۔ اگر موجودہ قرآن کو منزل قرآن تسلیم کریں تو تمام صحابہ اور کاتب وحی معاویہ کو " رضی اللہ عنہ " کہنا پڑے گا اور پھر تبرّیٰ و تولّی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا، اور پھر سبائیت کو اپنی شیطنت کی پردہ پوشی کا موقع نہ مل سکے گا۔

عقدِ تحکیم

جنگ کے اختتام کے بعد معاویہ اور علی کے مابین معاہدہ تحکیم عمل میں آیا۔اس تاریخی دستاویز صلح پر فریقین نے دستخط کر دیئے اور اس میں فریقین اور ان کے ساتھیوں کو مومنین و مسلمین تسلیم کیا گیا۔جیسا کہ دوران جنگ فریقین ایک دوسرے کو مومن و مسلم تسلیم کرتے تھے۔ معاویہ کی جانب سے صلح کی بات چیت کرنے کے لئے عمرو بن العاص کو نمائندہ نامزد کیا گیا۔علی چاہتے تھے کہ ان کی جانب سے عبداللہ بن عباس کو نمائیندہ مقرر کیا جائے لیکن سبائی" جو ہر سنجیدہ کام بگاڑنے پر تلے ہوئے تھے" اس بات پر مصر تھے ان کی جانب سے نمائیندہ ابوموسیٰ اشعری کو مقرر کیا جائے۔علی نے فرمایا، بھائیو! ابوموسیٰ اشعری تو مجھے اس جنگ میں حق بجانب ہی نہیں تسلیم کرتے وہ تو اس جنگ کو فتنہ عمیاو صماء اندھا و بہرا فتنہ قرار دیتے ہیں تو وہ میری نمائیندگی کا حق کیسے ادا کریں گے۔علی نے کہا بھائیو! میں تمہارا امیر تھا اور تم نے اب تک کوئی بات میری نہیں مانی، اب یہ آخری بات مان لو کہ ہماری نمائندگی کا حق ابوموسیٰ اشعری ادا نہیں کر سکتے لہٰذا ابن عباس کو نمائندہ نامزد کرو، انہوں نے کہا ہرگز نہیں، ہماری نمائندگی ابوموسیٰ اشعری ہی کریں گے۔علی خاموش ہو گئے اور ابوموسیٰ اشعری کو علی کا نمائندہ نامزد کیا گیا۔ابوموسیٰ نے اپنے طور پر علی کو معزول کر دیا اور چاہا کہ عمرو بن العاص معاویہ کو معزول کر کے از سر نو خلیفہ کے انتخاب کی شکل پیدا کریں لیکن عمرو بن العاص نے کہا کہ آپ نے اپنے طور پر علی کو معزول کر کے اختلاف کو ختم کر دیا ہے۔خلیفہ سوم کا مظلومانہ قتل اور ان کا قصاص نہ لیا جانا دونوں فریق کے مابین وجہ نزاع تھا۔بنو ہاشم میں علی سے بڑھ کر دوسرا کون ذی اثر شخص ملے گا، جو خون عثمان کا قصاص معاویہ کو دلوا سکے لیکن جب علی نہ کر سکے تو دوسرا کون کر سکے گا۔اب دوسرے فریق معاویہ ہے جو عثمان کے ولی اقرب ہیں۔وہ قصاص لینا چاہیں تو قصاص لیں، معاف کرنا چاہیں تو معاف بھی کر سکتے ہیں انہیں شرعاً دونوں باتوں کا اختیار ہے۔اختلاف کے ایک فریق کو آپ نے معزول کر دیا اب دوسرا فریق ہے جسے قصاص لینے یا معاف کر دینے کا حق حاصل ہے۔لہٰذا معاملہ اسی کے سپرد کر دینا زیادہ قرین مصلحت ہوگا بہ نسبت اس کے کہ اسے بھی معزول کر کے کسی تیسرے کا انتخاب کیا جائے پھر وہ تیسرا بھی تو قریش کے انھیں دونوں بڑے خاندانوں میں سے کسی ایک خاندان کا فرد ہوگا۔

بنوامیہ میں معاویہ سے بہتر اور بنو ہاشم میں علی سے بہتر شخص کہاں سے تلاش کیا جا سکے گا۔لہٰذا آپ نے تو علی کو معزول کر دیا اور میں معاویہ کو باقی رکھتا ہوں۔ابوموسیٰ اشعری بہت جزبز ہوئے اور اپنی عجلت پسندی پر شرمندہ و نادم بھی ہوئے۔عقد تحکیم میں بازی ہار کر گھر بیٹھے رہے اور شرمندگی سے ایک مدت تک علی سے ملاقات نہ کی۔علی اور شیعان علی تو معاملہ کو ایک رخ پر ہوتے دیکھ کر خاموش رہے لیکن بدبخت سبائیہ نے دوبارہ مسلمانوں کے درمیان شورش و اختلاف برپا کرنے کے لئے معاویہ اور عمر بن عاص اور علی تینوں کے خلاف شور و ہنگامہ برپا کیا۔معاویہ اور عمرو بن عاص پر بدعہدی کا الزام عائد کیا اور علی کو ان کے ساتھ صلح کرنے کے الزام میں کافر قرار دیا۔

ظہورِ خوارج:

حضرت علی کے نام نہاد حامیوں میں سے ایک جماعت نے کھل کر ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا ان کا نعرہ تھا: "إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ" "حکم اور فیصلہ تو اللہ کا ہے"۔

ان کے نزدیک اللہ کا فیصلہ" جو اس کی کتاب میں موجود ہے" یہ تھا: وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ

"اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان مصالحت کرادو اور اگر ایک دوسرے پر بغاوت کرے تو باغی گروہ سے اس وقت تک قتال جاری رکھو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے یعنی ترک بغاوت کر کے سمع و طاعت کا راستہ اختیار کرے"۔(الحجرات:10)

یہ لوگ معاویہ اور ان کے ساتھی گروہ کو اور اسی طرح عائشہ اور طلحہ و زبیر کے گروہ کو باغی قرار دیتے تھے حالانکہ ان میں سے کوئی ایک بھی اصلاً علی کی بیعت خلافت کا منکر نہ تھا اور رہی قصاص عثمان کے مطالبہ کی شرط تو وہ خلیفہ سوم کے باغیوں (سبائیوں) سے تحفظ کے لیے تھی اور قرآن پاک کے دیئے ہوئے حق کے عین مطابق تھی: وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا

"جو شخص مظلوماً قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کے لئے قاتل پر غلبہ کا حق رکھا ہے"

مصالحت کی گفتگو میں عمر بن العاص نے باقاعدہ یہی آیت ابوموسیٰ اشعری کے سامنے پیش کی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے حکم ماننے کا تقاضا یہی تھا کہ جو مسلمان بیعت سے علیحدہ تھے وہ بیعت کرتے اور جسے قاتل پر اللہ نے غلبہ کا حق دیا تھا اس کا مطالبہ قصاص پورا کیا جاتا۔ پھر اصحاب جمل تو قصاص سے پہلے ہی بیعت کے لئے علی کے ساتھ بات چیت پر رضامند ہو گئے تھے اور علی نے معاویہ سے قبل بیعت چار ماہ کی مدت میں قاتلین سے قصاص دلوانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا اور اس مدت کے دوران حالات بالکل پرسکون تھے۔ لیکن دونوں جگہ صلح و مصالحت اور انعقادِ بیعت کی راہ میں سبائیوں نے ہی روڑے اٹکائے۔ لہٰذا حضرت علی اور ان کے حامیوں (شیعان علی) کے خلاف خوارج کا الزام بالکل بے بنیاد تھا کہ انہوں نے قرآن کے بالکل واضح اور متعین حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کے خلاف عقدِ تحکیم کو قبول کیا ہے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ جمل اور صفین میں طرفین سے ایک لاکھ مسلمانوں کے قتل کے بعد قرآنی حکم کے برخلاف علی کسی طرح کی ثالثی قبول کریں یا وہ اور ان کے ساتھی صحابہ و اہل بیت کسی ناحق بات پر خاموش رہیں بلکہ الٹے رضامند ہو جائیں۔ اگر ابوموسیٰ اور عمرو بن العاص کی گفتگو میں ایسی کوئی دھاندلی واقع ہوئی ہوتی تو فوراً دوبارہ جنگ بھڑک اٹھتی اور جنگ کے اختتام کے وقت چونکہ غلبہ علی کی فوج کو حاصل تھا۔ لہٰذا جنگ میں بھی انہیں کی کامیابی متوقع تھی لیکن کمزور فریق کی جانب سے مصالحت کی بات چیت میں کھلی دھاندلی اور طاقتور فریق کی جانب سے صبر اور خاموشی بالکل ناقابل فہم بات ہے۔ دراصل تاریخ نویس یا تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اگر پہلے سے ہی صحابہ کو اہل بیت کا دشمن مان لے اور ان کو قرآنی تصریحات رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (آپس میں ایک دوسرے پر نہایت مہربان) وَأَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ (اہل ایمان کے مقابل خود کو ہیچ سمجھنے والے) رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَرَضُوا عَنْهُ (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے) کے مطابق

بالکل پکا سچا اور کامل مومن و مسلم تسلیم نہ کرے تو تاریخی واقعات کو بھی وہ گھما پھرا کر غلط معانی نکالنے کی کوشش کریگا۔صحابہ و اہل بیت سے باہر تابعین میں سے ایک بہت بڑا منظم گروہ سبائیوں کا تھا۔انہیں میں سے بعد کو خوارج نمودار ہوئے جنھوں نے علی کے خلاف منظم بغاوت کی اور انھیں اور ان کے ساتھیوں کو علانیہ کافر و مرتد قرار دیا۔انھوں نے علی کی بیعت کو توڑ کر اپنی جماعت سے اپنا امیر بھی چن لیا اور انہیں کے تین اشخاص نے بیک وقت عمرو بن العاص،معاویہ اور علی کو قتل کر دینے کا منصوبہ تیار کیا۔علی کو عبدالرحمن بن ملجم نے تلوار کے دو ضربات سے سخت زخمی کر دیا جس کے نتیجے میں وہ شہید ہو گئے اور معاویہ شدید زخمی ہو کر بال بال بچ گئے،عمرو بن عاص اتفاق سے اس دن بیمار تھے اور صبح نماز فجر کے لیے مسجد نہ جا سکے اس طرح قتل یا زخمی ہونے سے بچے۔خلفائے راشدین میں تین خلیفہ پے در پے دشمنان اسلام یہود و نصاریٰ اور مجوس کی سازش کا شکار بنے۔صرف ابو بکر کو جن کی مدت خلافت صرف دو سال پانچ ماہ کی مختصر مدت تھی انہیں کو اپنے بستر پر طبعی موت نصیب ہوئی۔

علی اور معاویہ و عمرو بن عاص کے باہم نزاع و اختلاف کے باوجود ایک ہی گروہ کے تین اشخاص نے بیک وقت تینوں کے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور ان اشخاص کا تعلق علی کے گروہ سے تھا یعنی خوارج سے۔

ظُہورِ روافض

علی کے خلاف خوارج کی بغاوت کے دوران شیعان علی کے نام سے ایک غالی فرقہ نمودار ہوا جو روافض کہلائے۔ ابتداءً شیعان علی تو وہ تھے جو جمل و صفین کی جنگ میں علی کے موقف کے حامی تھے اور جنہوں نے علی کے ساتھ معاویہ اور ان کے حامیوں کو عقدِ تحکیم کے وقت مومنین و مسلمین تسلیم کیا تھا اور وہ صحابہ اور اہل بیت تھے۔ لیکن خوارج نے جب علی پر حکم کفر لگایا اور قتال کا راستہ اختیار کیا تو روافض نے علی کو خدا مان کر مختارِ کل ہونے کا اعلان کر دیا اور خود کو صحابہ و اہل بیت سے الگ کر دیا تھا اور تعلقات ترک کر دیئے تھے۔ دراصل یہ سبائی تھے۔ جو تقیہ کر کے خود کو شیعان علی ظاہر کرتے تھے۔ حضرت علی نے اس فرقہ کے لوگوں کو ظلم عظیم (شرک) سے باز رکھنے کے لیے آگ کی خندقوں میں ڈھکیل کر زندہ جلا دینے کا حکم دیا تھا۔ لوگوں نے علی کو ایسا کرنے سے روکا کہ آپ انہیں ایسی سزا نہ دے جو اللہ نے اپنے لیے مخصوص کی تھی۔ تو علی نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ مجھے خدا کا شریک ٹھہرائیں گے تو خدا میرے ہاتھوں سے انہیں ایسی سزا دلوائے گا جو اس نے اپنے لیے مخصوص کی ہے۔

یہ خلافت علی کے دور کا ایک آخری فتنہ تھا کہ انھیں اپنے نام نہاد حامیوں کے ساتھ ایسا سلوک بھی کرنا پڑا۔ وہ حامی نہ تھے بلکہ حمایت کے نام پر علی کو مسلمانوں میں بدنام کرنے کے درپے تھے۔ گویا یہ سبائی شیطنت کی انتہا تھی۔

معاویہ کی خلافت کا استحکام

عقدِ تحکیم میں علی کے معزول کیے جانے کے بعد عرب کے تمام صوبے ایک ایک کر کے معاویہ کو اپنا خلیفہ تسلیم کر چکے تھے۔ صرف ایک صوبہ عراق باقی تھا جو اس پورے دورِ نزاع میں فتنوں کا سب سے بڑا مرکز بنا۔ جس طرح عثمان اور معاویہ کے حامیوں کا مرکز صوبہ شام تھا اسی طرح علی کے حامیوں کا سب سے بڑا مرکز عراق تھا۔ لیکن اہل شام نے جس طرح ہر ہر موقع پر معاویہ اور ان کے خاندان کے ساتھ وفا کی، اہل عراق نے علی و اہل بیت کے ساتھ قدم قدم پر غداری اور دغا کی۔

حسن بن علی کی خلافت

اب جب کہ تمام صوبے ایک ایک کر کے معاویہ کی بیعت قبول کر چکے تھے تو اس بات کا سوال ہی نہ تھا کہ حضرت امام حسن اہل کوفہ کے امیر بننے پر رضامند ہوتے، لیکن اہل عراق بنو امیہ کے کسی ایک فرد کو بھی اپنا خلیفہ و امام ماننے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ وہ اس بات پر بضد تھے کہ معاویہ کو اپنا امیر تسلیم نہ کر کے حسن ابن علی کو اپنا امام و امیر بنائیں گے۔ چنانچہ حضرت امام حسن نے اپنی خلافت کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کو کسی اور متوقع فتنہ سے بچانے کے لیے محض مصلحتاً ان کی یہ پیشکش قبول کر لی اور ان سے سمع و طاعت کی بیعت لے لی۔

اب معاویہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ جب تمام صوبے ان کی اطاعت قبول کر چکے تو اہل عراق اپنا امیر کسی اور کو چن لیں۔ لہٰذا انہوں نے اہل عراق کی طرف پیش قدمی کی تو اہل عراق نے بھی کمر ہمت باندھی کہ وہ امام حسن کی خلافت کے لئے معاویہ سے لوہا لینے کے لیے تیار ہیں۔

چنانچہ اہل عراق کی خواہش اور تقاضے کے مطابق امام حسن عراقی مجاہدوں کی فوج لے کر مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں رات کے وقت وہ ایک مقام پر قیام فرمایا، تو آپ نے اپنے چند مخصوص لوگوں کو متعین کر دیا کہ لوگوں کے خیموں کے قریب جائیں، اور کان لگا کر اس کی سرگوشیاں سنیں، کیونکہ دھوکہ دہی کی ایسی سازشیں کرنے کے لئے اہل عراق اب کافی حد تک بدنام ہو چکے تھے۔ صبح حضرت حسن کو خبر دی گئی کہ اکثر لوگ خیموں میں آپ کی اس پیش قدمی کا ہنس ہنس کر مذاق اڑا رہے تھے کہ جب تمام صوبے عرب کے علی کے ساتھ تھے اور صرف ایک صوبہ معاویہ کے پاس تھا تو علی کی ان سے پیش نہ گئی اور صفین کی جنگ ہار بیٹھے اور آج جب کہ عراق کے علاوہ تمام صوبے معاویہ کی امارت کو تسلیم کر چکے ہیں تو علی کے صاحبزادے اہل عراق کو لے کر آج معاویہ کا مقابلہ کرنے جا رہے ہیں۔

امام حسن کی معاویہ سے صلح

حضرت امام حسن نے جب عراق مفسدین کی یہ باتیں سنیں تو اسی مقام سے ایک خط معاویہ کو لکھ دیا کہ ہم آپ سے جنگ نہیں صلح کرنا چاہتے ہیں۔ حسن کی معاویہ کے ساتھ اس صلح کی پیشکش کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ وہ خود کو اور اپنے متبعین کو معاویہ کی بیعت میں داخل کرنا چاہتے تھے اور اب اس کے جواب میں معاویہ کی طرف سے اتنا ہی تحریر کر دینا کافی تھا کہ ہم آپ کے ممنون احسان اور شکر گزار ہیں کہ آپ نے مسلمانوں کو باہم جدال و قتال سے بچا لیا۔

لیکن معاویہ نے امام حسن کو اس کے جواب میں لکھا: اے نواسہ رسول اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ مجھ سے علم و فضل، دین و دیانت اور ورع و تقویٰ میں فائق و برتر ہیں۔ لہٰذا اگر آپ مجھے باور کرا سکیں کہ اس درجہ اختلاف و انتشار کے دور میں آپ اپنی سیاسی حکمت عملی سے مسلمانوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیں گے تو سب سے پہلے میں خود آپ کی بیعت کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اگر آپ کو میری سیاسی بصیرت پر اعتماد ہے تو یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دے اور جو بھی شرائط آپ مجھ سے منظور کرانا چاہیں وہ اس منسلکہ سادے کاغذ پر جس پر میری دستخط مہر خلافت کے ساتھ ثبت ہے "لکھ بھیجیں" وہ مجھے پیشگی منظور ہیں۔

امام حسن معاویہ کے اس خط سے بے حد متاثر ہوئے اور اس فیاضانہ پیشکش کو معاویہ کے خلوص اور نیک نیتی پر محمول کیا اور پھر چار شرطوں کے ساتھ معاویہ سے صلح کر لی اور ان کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے وہ چار شرطیں حسب ذیل تھیں۔

1) اہل عراق کو عام معافی دے دی جائے اور ان سے کسی قسم کا انتقام نہ لیا جائے۔

2) اھواز کے علاقہ کا خراج مجھے اپنے اخراجات کے لئے دے دیا جائے۔

3) حضرت امام حسین کو 12 لاکھ درہم ان کے سالانہ اخراجات کے لیے دیا جائے۔

4) صلات و عطیات میں حسب دستور سابق بنو ہاشم کا لحاظ رکھا جائے۔

معاویہ نے من و عن ان چار شرطوں کو منظور کر لیا اور امام حسن نے امیر معاویہ کی اطاعت قبول کر لی۔

حضرت حسن پر اہل کوفہ کی برہمی

جب اہل کوفہ کو یہ علم ہوا کہ حضرت حسن نے معاویہ کی اطاعت قبول کی ہے تو انہوں نے ان پر سبّ وشتم کیا۔ منہ پر تھوکا اور گریبان چاک کر دیا اور مذل المومنین، عار المومنین اور مسود وجوہ المومنین جیسے بدترین خطابات سے نوازا۔

حضرت امام حسن نے فرمایا: "طاعتکم طاعة معروفه" تمہاری اطاعت شعاری کا حال مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ لہٰذا میں نے تمہارے لئے وہی راستہ اختیار کیا ہے جس میں تمہاری مصلحت اور بہتری دیکھی۔ بس اب جا کر تم بھی معاویہ کی اطاعت قبول کرلوں اور زیادہ شیخیاں مت مارو۔

شہادتِ حسن

جب اہل کوفہ کے ناپاک عزائم کو حسن نے اس طرح ناکام بنا دیا تو ان کے پاس آپ سے انتقام لینے کا کھلا ہوا راستہ باقی نہ رہا اگر وہ اس واقعہ کے بعد امام حسن کو اسی طرح قتل کرتے جس طرح امام حسین کو کربلا میں شہید کیا تو معاویہ کے غیظ وغضب کا نشانہ بنتے اور پھر معاویہ کے لیے بھی ان سے کھل کر انتقام لینے اور ان کو ان کی شرارتوں کی پوری سزا دینے کا جواز فراہم ہو جاتا۔ لہٰذا انہوں نے حسن کو زہر دلوا کر شہید کرا دیا۔ اور پھر سبائیہ نے الٹے اس کی ذمہ داری معاویہ کے سر تھوپنی چاہی۔ حالانکہ یہ بات کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ معاویہ جیسا دور اندیش سیاسی انسان اپنے انتہائی مخلص ومحسن کو خود زہر دلوا دے۔ معاویہ نے تو امام حسین سے کوئی تعرض نہ کیا جن کے متعلق ان کو مسلسل خبریں پہنچائی جاتی رہی ہیں کہ وہ درپردہ ان کی بیخ کنی میں مصروف ہیں بلکہ ان کے حق میں اپنے بیٹے یزید کو وصیت کی تھی کہ اہل کوفہ حسین کو تمہارے خلاف ابھارنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن وہ ہمارے محسن ہیں اور ہمارے رسول کے نواسے ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ درگزر اور رواداری کا برتاؤ کرنا۔ حضرت حسن سے معاویہ کو کون سا خطرہ تھا جب کہ وہ ان کے حق میں اپنی خوشی سے خلافت سے دستبردار ہو چکے تھے اور اپنے بعد یزید کے لیے جس سے خطرہ تھا وہ حسین تھے نہ کہ حسن۔ حسن نے تو ایک بار کوفہ کے سبائیوں کا منہ کالا ہی کر دیا تھا۔ لہٰذا وہ دوبارہ ان کی طرف کب نظر اٹھا سکتے تھے۔ دراصل پوری تاریخ سبائیت میں ایک چیز ہر جگہ نظر آئیں گی۔ یعنی ایک ہی تیر سے چند شکار۔ تخریب کاری اور پھر اس کا الزام بھی انہی پر ڈالنا جن کی تخریب کی جا رہی ہے۔ معاویہ کا ایک بازو بھی کاٹ دیا اور پھر انہی پر الزام عائد کر دیا کہ انھوں نے خود ایسا کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ معاویہ کی زندگی میں کسی کی مجال نہ ہوئی کہ ان کی بابت ایسی کوئی بات اپنی زبان پر لا سکے۔

خاندان نبوت پر سبائیت کا آخری وار

اب امام حسن کے بعد ان کے چھوٹے بھائی امام حسین تھے ۔ یزید کے لئے خلافت کی بیعت معاویہ نے اپنے ارباب شوریٰ کے مشورے سے لے لی تھی ۔شورائیت عامہ کا خاتمہ تو علی کی خلافت ہی سے ہو چکا تھا ۔اب تو گروہی سیاست کا دور تھا ۔لہٰذا جو لوگ معاویہ پر معترض ہوتے ہیں کہ انہیں ایسا کرنے کا حق نہ تھا وہ اس وقت کے حالات کی نزاکت پر نظر نہیں رکھتے وہ ابوبکر وعمر کے دور پر نگاہ رکھتے ہیں جس وقت مسئلہ خلافت کی بابت مسلمانوں میں کوئی ادنیٰ کشمکش بھی نہ تھی ۔شیخین نے رسول کی نیابت کا حق جس طرح ادا کیا اسے دیکھ کر ہر کس و ناکس خلافت کی تمنا بھی نہیں کرسکتا تھا ۔لیکن قتل عثمان کے بعد قریش کے دونوں بڑے خاندانوں (بنوہاشم اور بنوامیہ) میں وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی کہ بلا اختلاف و کشمکش ایک خاندان دوسرے خاندان کی سرداری قبول کرلے ۔خود حضرت علی نے دونوں جنگوں کے مصائب گوارا کر لیے لیکن شورائیت عامہ کی بابت کوئی بات نہ سوچ سکے ۔لہٰذا جب جمل وصفین سے پہلے اس کا امکان ختم ہو چکا تھا تو اس کے بعد کیسے ہوسکتا تھا ۔لہٰذا معاویہ کو اپنے دور میں ایسا کوئی اقدام کرنے کے لیے اپنی ہی شوریٰ سے مشورہ کرنا تھا ۔تاریخی واقعات شاہد ہے کہ معاویہ کو ایسا کرنے میں کسی قسم کی کوئی خاص دشواری اور مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا ۔صرف قابل ذکر ہستیوں میں سے چار حضرات نے یزید کی بیعت نہیں کی تھی پھر ان میں سے بھی دو نے یعنی ابن عمر وابن عباس نے بیعت کرلی ۔اب صرف امام حسین اور عبداللہ ابن زبیر تھے ۔تاہم دونوں میں فرق تھا ۔عبداللہ ابن زبیر مکہ میں کھل کر حجاج کے مقابلے پر ڈٹ گئے اور جان دے دیں ۔لیکن امام حسین نے خود اپنی جانب سے کوئی مخالفانہ رویہ اختیار نہیں کیا تھا ۔اہل کوفہ انہیں طرح طرح سے اکساتے رہے ،خطوط پر خطوط اور وفود پر وفود ان کی خدمت میں بھیجتے رہے ۔پے درپے خطوط کے دو تھیلے حضرت حسین کے پاس پہنچا دیئے گئے ۔لیکن امام حسین کو پھر بھی ان غداروں پر یقین نہ آیا تو صورتحال کا مشاہدہ کے لیے اپنی چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو بھیجا ۔ان کے ہاتھ پر 18 ہزار افراد نے حسین کی بیعت کرلی ۔اور بعض روایت کے مطابق تیس ہزار افراد نے حسین کی بیعت کرلی جس پر انہوں نے حضرت حسین کو کوفہ آنے کی دعوت دی ۔

اب جبکہ مکہ سے حسین بن علی کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تو قدم قدم پر آپ کے رفقاء نے کوفہ جانے سے آپ کو روکنا چاہا اور کہا کہ اہل کوفہ غدار ہیں آپ کے والد اور بڑے بھائی سے غداری کر چکے ہیں وہ آپ کے ساتھ وفا نہ کریں گے اور آپ کے سامنے ہمیں بلائیں نظر آرہی ہے ۔مگر حضرت مسلم کے خط کے بعد اپنے کسی کے مشورہ کی پرواہ نہ کی اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ مقام کربلا پر پہنچ کر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا ۔کوفہ کو علی نے اپنا دارالخلافہ بنایا تھا اور وہاں ان کے ماننے والوں کی اکثریت تھی جس طرح معاویہ اور یزید نے شام کو اپنا دارالخلافہ بنایا جہاں ان کے حامیوں کی اکثریت تھی فرق صرف یہ تھا کہ اہل شام وفا شعار تھے اور انہوں نے اپنے امام سے کبھی غدر نہیں کیا ۔اور اہل کوفہ بد باطن اور غدار تھے جنہوں نے اپنے اماموں (علی وحسن وحسین) سے کبھی وفا نہیں کی ۔

اب امام عالی مقام اہل کوفہ کی دعوت پر سیکڑوں پیغامات وصول کر کے عازم کوفہ ہو رہے ہیں ۔قدم قدم پر ان کے بھائی وہاں کے خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں ۔اور صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ اہل کوفہ غدار ہیں کسی نے یہ نہیں کہا کہ یزید آپ کا جانی دشمن ہے ۔اس لیے وہاں نہ جائیے ۔ یزید کو اپنا نظام حکومت چلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ ان کی بیعت کی ضرورت تھی ۔اور کم سے کم اس بات کی کہ آپ اس

کے خلاف کوئی سازش نہ کریں۔لیکن حضرت امام والا مقام سازش کرنے والا بھی نہ تھے۔زیادہ سے زیادہ یہی تھا کہ بیعت سے علیحدہ تھے اور ایک فرد کی بیعت سے کنارہ کش رہنے سے نظامِ حکومت میں کونسا خلل واقع ہوسکتا تھا۔پھر ان کے لیے نہ مکہ میں کوئی خطرہ تھا، نہ مدینہ میں اور نہ ہی شام میں جہاں خود یزید موجود تھا۔تو یہ خطرہ ایسے علاقے میں کیوں پیش آیا جہاں ان کے حامیوں کی اکثریت تھی۔

یہ دو تھیلے دعوتی خطوط کے اور وہ 18 سے 30 ہزار سورما جنہوں نے حسین کی بیعت کی تھی اور انہیں کوفہ آنے کی دعوت دی تھی، اس وقت کہاں تھے جب کربلا کے مقام پر عبید اللہ بن زیاد کی بھیجی ہوئی فوج ان پر خونخوار درندوں کی طرح ٹوٹ پڑی تھی۔کربلا کوفہ سے کچھ اتنا دور بھی نہ تھا۔آخر وہ عرب تھے، جنگجو تھے، لڑنا مرنا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔جمل وصفین میں بھی لڑے تھے اور اس کے بعد بھی لڑتے مرتے رہے۔اگر لڑ مر نہ سکے تو حسین ابن علی اور خاندان رسالت کی حمایت میں، مکہ ومدینہ کے لوگوں نے تو صرف خیر اندیشانہ مشورہ دیا۔پوری کوشش سے روکا مگر ان کے ساتھ اہل کوفہ کی سازش کا شکار ہو کر قتل ہونے نہ گئے۔لیکن اہل کوفہ نے بلایا اور بیعت شکنی کی اور قتل کر دیا۔ لہٰذا ان میں سے غدار اور دشمن حسین کون ہے؟

خود حضرت حسین کو جب اہل کوفہ کی غداری اور مسلم بن عقیل کے قتل کئے جانے کی اطلاع ملی تو انہوں نے وہیں سے واپسی کا ارادہ فرمالیا تھا۔لیکن مسلم کے افراد واپسی پر رضامند نہ ہوئے تو آپ نے بھی واپسی کا خیال ترک فرمادیا۔پھر جب کربلا کے مقام پر پہنچ کر پوری صورتحال سامنے آگئی تو خود حضرت حسین نے یزید سے بات چیت کر کے معاملہ طے کر لینے کی خواہش ظاہر کی تھی جسے کوفہ کے غداروں نے یکسر مسترد کر دیا۔

اہل کوفہ کی ایسی ہی غداری کا مشاہدہ کر کے امام حسن نے ان کے علی الرغم معاویہ سے صلح کر لی تھی اور اب لوگ حسین کی خواہش کے مطابق انہیں یزید سے مل کر بات چیت کا موقع دیا جاتا تو وہ بھی یقیناً کچھ شروط وعہود کے ساتھ یزید کے ساتھ صلح کر لیتے۔کیونکہ ان پر یہ بات بالکل عیاں ہو چکی تھی کہ ان کی حمایت کے لئے کوئی بھی آمادہ نہیں ہے۔

پھر جب کوفی علی اور حسن وحسین کے نہ ہوسکے تو معاویہ اور یزید کے خیر خواہ کب ہو سکتے تھے؟ جب یہ اپنے امام سے غداری کا الزام اپنے سر لے سکتے تھے تو یزید ومعاویہ کی خیر خواہی کب کر سکتے تھے؟ اگر یزید کے خیر خواہ ہوتے تو اس میں ذرہ برابر کوئی مضائقہ نہیں تھا کہ انہیں یزید سے مل کر معاملہ طے کرنے کا موقع دے دیتے۔یہ کون سی خیر خواہی تھی کہ پورے خاندان نبوت کا سر قلم کر کے یزید کی خلافت کے استحکام کا دعویٰ کیا جائے جب کہ خود یزید بھی یہ جان کر کہ حضرت حسین ان سے مل کر بات چیت کے خواہشمند تھے کافی رنجیدہ ہوا۔اور عبید اللہ بن زیاد گورنر کوفہ پر بار بار لعنت کے الفاظ دہرائے بلکہ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوفہ کے لوگ امام حسین کے گرد اپنی سازشوں کا جال بن رہے ہیں تو ان کو مع اہل وعیال یہاں اپنے پاس بلا لیتا خواہ اس سے ہمیں کوئی سیاسی نقصان ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑتا۔

یزید کے گھر حسین کی شہادت پر غم منایا گیا۔اس نے اپنے مکان سے متصل ایک خالی مکان میں حضرت امام کی عورتوں بچوں کو ٹھہرایا۔ان کو چند دن عزت کے ساتھ اپنی مہمانی میں رکھا اور پھر پوری عزت واحترام کے ساتھ اپنی سواری پر مدینہ بھجوا دیا۔بوقت رُخصت امام زین العابدین سے کہا: دیکھو مجھ سے برابر خط وکتابت کرتے رہنا کوئی بھی ضرورت پیش آئے مجھے مطلع کرنا۔

حضرت سکینہ اکثر کہا کرتی تھی کہ میں نے کبھی کوئی ناشکرا انسان یزید سے زیادہ احسان کرنے والا نہیں دیکھا۔ پوری زندگی یزید آل حسین کے ساتھ حسن سلوک کرتا رہا اور مدینہ سے جو لوگ آتے ان سے ان کی خیریت دریافت کرتا۔

فاطمہ بنت حسین نے کہا: اے یزید! کیا رسول اللہ ﷺ کی لڑکیاں کنیزیں ہوگئیں؟ یزید نے کہا: اے میرے بھائی کی بیٹی! ایسا کیوں ہونے لگا؟ فاطمہ نے کہا: بخدا ہمارے کانوں میں ایک بالی بھی نہیں چھوڑی گئی۔ یزید نے کہا کہ: تم لوگوں کا جتنا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ میں تم کو دوں گا۔ چنانچہ جس نے اپنا جتنا نقصان بتایا اس سے دوگنا تین گنا ہر ایک کو دیا گیا۔

اب حسین و آل حسین کہ جن کے ساتھ یہ واقعات پیش آئے خواہ اہل کوفہ کے ناپاک عزائم سے وہ یکسر بے خبر رہے ہوں لیکن یہ سلسلہ مظالم ان پر گزر جانے کے بعد اب تک وہ اس بات سے غافل تھے کہ دراصل قاتل کون تھے اور ان کے ناپاک عزائم کیا تھے؟ ظاہر ہے کہ اگر ان کی نظروں میں قصوروار بذات خود یزید ہوتا اور وہ اس قتل وخونریزی کا ذمہ دار اسی کو سمجھتے تو آل حسین کی مثالی غیرت انہیں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ یزید کے مہمان خانہ پر بیٹھ کر کان کی بالیاں جیسی حقیر چیزوں کا اس سے مطالبہ کریں۔ ایسا مطالبہ تو کسی ایسے شخص سے ممکن تھا جسے وہ اپنا غمگسار اور خیر خواہ سمجھتے ہوں۔ اور پھر بی بی سکینہ کا ہمیشہ اس کے سلوک و احسان کا تذکرہ اپنی زبان پر لاتے رہنا خود اس بات کا ثبوت تھا کہ یزید ان کی نظروں میں قاتل حسین نہ تھا۔ آل حسین ہفتہ دس روز یزید کی مہمانی میں رہے۔ یزید اور اس کے خاندان کی عورتیں جس طرح آل حسین کے غم میں برابر کی شریک رہیں اور پھر جس طرح ان کی وہاں خاطر و مدارت ہوئی اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ یزید کے افراد خاندان ان کے ساتھ پیش آئے اور خود درد و حسرت سے یزید کا بار بار عبداللہ بن زیاد اور قاتلین حسین پر لعنت کرنا، برابر اپنے ساتھ زین العابدین کو اپنے دستر خوان پر بٹھا کر دو وقت کا کھانا کھلانا، یہ ساری باتیں ان کی نظروں میں تھیں۔ پھر حسین کی یزید سے مل کر بات چیت کرنے اور مسئلہ کو ترک کرنے کی خواہش جسے ظالموں نے یکسر مسترد کر دیا: حالانکہ اگر یہ بات ایک طرف حسین کے حق میں تھی کہ "انہیں اس مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑتا" تو اس سے کہیں بڑھ کر خود یزید کے حق میں تھی کہ اس کا عہد حکومت آل رسول کے خون سے بری رہتا۔ لہذا ابن زیاد نے، عمرو بن سعد نے یا شمر اور اس کے ساتھیوں نے جو کچھ مظالم محض اپنی شیطنت سے فتنہ پردازی کے لیے کئے اس سے یزید کی حکومت کا فائدہ ہوا یا اس کی بنیادیں ہل گئیں؟ یہ مقتولین کربلا کے سر نیزوں پر اٹھائے ہوئے شغال زادے جو کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک دوڑے کہ یزید کی خوشنودی حاصل کریں اور انعام و اکرام سے نوازے جائیں۔ انہیں یزید کی جانب سے صرف لعنت کے جوتے دیئے گئے۔ سبائیت نے یہاں بھی ایک تیر سے دو شکار کیئے۔

1) خاندان نبوت کا خاتمہ اور 2) یزید کی رسوائی کا سامان۔

قاتلین حسین پر اللہ کی ابد تک لعنت ہوتی رہے خواہ وہ کوئی ہوں جس کا ادنیٰ اشارہ یا اس کی رضا ان کے قتل میں ہو۔ اس پر خدا کی ہزار بار لعنت ہو۔ لیکن ایک دیانت دار مورخ جو صرف آنکھیں بند کر کے سبائیت کا راگ نہ الاپ رہا ہوں، تاریخ کی روشنی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ خون ناحق جو سراسر یزید کی مصالح کے خلاف تھا خود یزید کے حکم یا اس کی اجازت و رضا یا اس کے کسی ادنیٰ اشارے پر بہایا گیا ہوں۔ ایسا کسی شیعہ تاریخ سے بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سبائیت آج تک اپنے گریہ و ماتم اور سینہ کوبی کے ساتھ دنیا کو باور کرانا چاہتی ہے کہ یزید ہی

ان کے تمام واقعات کربلا کا ذمہ دار تھا، لہٰذا اس پر لعنت بھیجنا ضروری ہے اور پھر خلافت یزید کی ذمہ داری معاویہ پر اور معاویہ کی ذمہ داری عمر و عثمان پر اور عمر کی ذمہ داری ابوبکر پر ڈال کر اس پورے سلسلہ خلافت پر لعن طعن کا بازار گرم کیا جاتا ہے۔ یہ تو سبائیت کی اس شاخ کا کارنامہ ہے جسے رافضیت کا نام دیا جاتا ہے اور اس کی دوسری شاخ خارجیت نے تو علی اور ان کے تمام اہل بیت کو یکسر کافر و مرتد قرار دیا اور ان کو واجب القتل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ نعوذ باللہ

خوارج نے جب علی کے خلاف بغاوت کی تو انہیں قتل عثمان کی سازش میں بھی شریک ٹھہرایا۔ استغفر اللہ! معاویہ کو تو پہلے سے کافر قرار دے چکے تھے لیکن اس کے بیٹے یزید پر اتنے مہربان ہوئے کہ اسے ابوبکر و عمر سے بھی افضل خلیفہ قرار دے دیا اور معاذ اللہ حضرت حسین کو باغی اور واجب القتل گردانا۔ یہ رہی سبائیت کی دوسری شاخ یعنی خارجیت۔ بس سبائیت کی یہی دونوں شاخیں مل کر صحابہ و اہل بیت سب کو کافر و مرتد قرار دے کر پورے دین و ایمان و اسلام و قرآن کی نفی کر دیتی ہے اور یہودیت کا یہی مقصد ہمیشہ سے رہا ہے: آمِنُوا بِالَّذِی أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

"ایمان لاؤ اس کتاب پر جو اہل اسلام پر اتاری گئی، دن کی ابتدائی حصے میں اور دن کے آخری حصے میں اس کے منکر ہو جاؤ تاکہ اہل اسلام اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں۔"

پس اس آیت کے بمصداق عبداللہ بن سبا یہودی حضرت عثمان کی خلافت میں داخل اسلام ہوا اور صوبہ شام کے علاوہ ایک ایک صوبہ میں اپنی سازشی مراکز قائم کئے اور حضرت عثمان سے لے کر امام حسین تک ایک ایک امام اور خلیفہ کو قتل کرا دیا۔

حضرت عثمان کے عہد میں ان کی خلافت کو اکھاڑنے کے لیے مسلمانوں میں یہ مطالبہ عام کیا گیا کہ خلافت رسول کے اصل حقدار بنو ہاشم ہے۔ لہٰذا امویوں کو خلافت کا حق نہیں۔ اگر بات یہی تھی تو امویوں کے بعد جب عباسیوں کی خلافت کا دور شروع ہوا تو ان کا یہ مطالبہ پورا ہو گیا تھا کیونکہ بنو عباس بنو ہاشم ہی تھے۔ لیکن اب سبائیوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا کہ خلافت کے اصل حقدار بنو فاطمہ ہے۔ لہٰذا عباسی خلفاء بھی بنو فاطمہ کے حق کے غاصب ہیں لہٰذا اب عباسی خلافت کے خلاف ان کی ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ ان ہی دنوں ان میں ایک فرقہ باطنیہ پیدا ہوا جس نے ظاہر شریعت کی کلیتاً نفی کر دی اور عیش و عشرت و اباحیت کا دروازہ دو پٹ کھول دیا۔ ان میں ایک شخص حسن بن صباح نکلا جس نے مصنوعی جنت بنوائی جس میں وہ لوگوں کو نشہ کی حالت میں داخل کراتا اور وہاں کے حور و غلمان سے ہم آغوش کرا کے دوبارہ نشہ کی حالت میں چند روز بعد جنت سے باہر کرا دیتا تھا اور پھر ان طالبانِ جنت سے اس کے کارپرداز، ان کی قربانیوں کے عوض جنت کا سودا کرتے اور عباسی خلیفہ کو اس طرح قتل کرا دیتا تھا۔

اس طرح خلفاء بنو عباس کا قتل حسن بن صباح کی جنت کی قیمت تھی۔ لیکن عباسی خلفاء بڑے زبردست تھے۔ انھوں نے اس فتنہ کو نیست و نابود کر دیا تو آخری چارہ کار کے طور پر عباسی خلافت کی بیخ کنی کے لئے ہلاکو خان تاتاری کو بغداد تاراج کرنے کی دعوت دی گئی۔ خلیفہ مستعصم باللہ کے دو انتہائی قابل وزیر تھے جو خود کو شیعانِ علی کہتے تھے۔ شیعان علی سے کسے پرہیز ہو سکتا تھا۔ جسے علی سے لگاؤ تھا، اسے شیعان علی سے بھی الفت تھی لیکن وہ صرف نام کے شیعان علی تھے دراصل وہ سبائی تھے جو تقیہ کے طور پر خود کو شیعانِ علی ظاہر کرتے تھے۔ وہ تھے ناصر

الدین طوسی اور ابن علقمی ۔ان دونوں سبائیوں نے ہلاکو خان کو بغداد تاراج کرنے کی دعوت دی تھی اور بغداد کا اتنا مکمل نقشہ رومال پر بنا کر تاتاری افواج کی رہنمائی کے لیے بھیجا گیا تھا کہ جس میں بغداد کی ایک ایک گلی وکوچہ دکھایا گیا تھا اور اس کی قیمت تاتاریوں سے صرف یہ چاہی گئی تھی کہ مصر میں کچھ دنوں کے لیے بنو فاطمہ کی حکومت قائم ہو جائے ۔

چنانچہ ان کی سازشوں سے عباسی خلافت کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ تمام بغداد خون میں غرق کر دیا گیا۔ تمام عباسی امراء وعلماء کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا ۔ دریائے دجلہ مسلمانوں کے خون سے سرخ ہوا تو دریائے فرات جلی ہوئی اسلامی کتب خانوں کی سیاہی سے سیاہ ہوگیا تھا۔ قیامت برپا تھی اور کسی کو کسی بات کا ہوش نہ تھا مگر اس بات کا سب کو ہوش تھا کہ بغداد کے در و دیوار پر لکھ دیا گیا تھا کہ" خدا اس شخص پر لعنت کرے جو ابن علقمی پر لعنت نہ کرے"۔

اس خونریزی کے عوض صرف دو ڈھائی سال تک مصر میں بنو فاطمہ کی نام نہاد خلافت قائم کر دی گئیں جو بعد کو ختم کر دی گئی.لہذا تمام تر لعنتیں یہود کی اس سازشی ایجنسی سبائیت پر ہوں جن کی گردنوں پر تمام خلفائے اسلام کا خون ہے ۔معاملہ یہیں پر نہیں ختم ہو جاتا۔ ترکوں نے عربوں سے عنانِ حکومت تو چھین لی لیکن ایک صدی کے اندر وہ خود داخلِ اسلام ہو کر اسلام کے جھنڈے تلے تقریباً سات سو سال تک اسلام وقرآن وکعبہ وقبلہ اول کی حفاظت کرتے رہے اور تمام باطل طاقتوں اور صلیبی قوتوں کا تنہا مقابلہ کرتے رہے.انہوں نے پورے چار صدیوں تک دنیا بھر کے مسلمانوں کو حفاظتِ اسلام کی ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا تھا اور تنہا تمام باطل محاذوں پر ڈٹے رہے اور ایک ایک دشمن طاقت سے اپنا لوہا منواتے رہے ۔پھر ان کا بھی زوال آخر یہود ونصاریٰ کی سازشوں سے ہی ہوا جنہوں نے عربوں کو خلافت کا حقدار قرار دے کر ترکوں کے مقابل کھڑا کیا اور صلیبی قوتوں کی تائید وحمایت سے عثمانی خلافت کا خاتمہ کرایا اور تمام عرب ممالک کو عثمانیوں سے آزاد کرا کے انہیں چھوٹی چھوٹی تیرہ ریاستوں میں تقسیم کر دیا اور عربوں کو لے جا کر انہیں صلیبی طاقتوں کی گود میں بٹھا دیا۔ 1946ء میں ان کے قلب میں اسرائیلی ریاست کا خنجر بھی پیوست تو کر دیا تا کہ اگر کوئی حرکت ہو تو یہیں سے عربوں پر ضرب کاری بھی لگائی جا سکے۔ وہ آج تک اپنے ہاں نظامِ خلافت کے دوبارہ احیاء سے عاجز وقاصر ہیں ۔

غالباً امیر فیصل مرحوم نے اس بابت کچھ سوچا ہی تھا کہ ان کو بھی فوراً آڑے ہاتھوں لے لیا گیا۔ ہاں اسپین کی آٹھ سو سالہ خلافت کے زوال کے اسباب میں مؤرخین شیعوں کی سازش کا عمل دخل مانتے ہیں لیکن دراصل وہ شیعہ نہیں بلکہ وہ سبائی تھے، شیعیت کا لبادہ انہوں نے ہر دور میں اپنے اوپر رکھا تا کہ ان سازشی عزائم پر کسی مسلمان کی نگاہ نہ پڑھ سکے حتیٰ کہ ہندوستان میں مغل حکومت کے اسبابِ زوال میں بھی سب سے بڑا سبب گولکنڈا کی شیعہ ریاستوں کی بغاوت اور میر صادق اور میر جعفر کی غداری کو قرار دیا جاتا ہے ۔لیکن آج تک یہ بد باطن طبقہ محرم الحرام کے موقع پر سال بہ سال اپنے گریہ وماتم اور سینہ کوبی کے شور و ہنگامہ میں یہی کہتا چلا آ رہا ہے کہ علی اور آلِ رسول پر مظالم خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئے ہیں ۔

ابھی آٹھ سال کی بات ہے کہ آیت اللہ خمینی وارد ایران ہوئے تو ان کا دعویٰ تھا کہ وہ حضرت علی کے طرز کی خلافت قائم کریں گے.انہوں نے خود کو امامِ زماں کہلوایا اور اللہ اکبر خمینی رہبر کے نعرے لگوائے اور اپنے فوٹو تصاویر اس کثرت سے ایران اور بیرون ایران پھیلائے کہ

ان کے عقیدت مندوں نے گویا اسے جلب منفعت اور دفع مضرت کے لیے ایک تعویذ بنا رکھا ہے۔انہوں نے بیک زبان امریکہ،اسرائیل اور روس کو درجہ اول کا اسلام دشمن ٹھہرایا اور چھوٹے بڑے شیاطین قرار دے دیا۔لیکن آج پورے آٹھ سال سے ان کی جو جنگ ایک پڑوسی مسلم ملک عراق سے جاری ہے وہ کس مقصد سے ہے؟

شاہ ایران اگر چہ امریکہ نواز تھا لیکن اس کے زمانے میں ایران فوجی واقتصادی اعتبار سے کافی طاقتور اور مضبوط تھا اور آج ایران علی کے طرز پر خلافت کا دعویٰ کر کے خود بھی ویران ہو چکا ہے اور عراق کو بھی تباہ و برباد کر چکا ہے۔جنگ کی ابتدا عراق ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔لیکن از ابتدا تا امروز جب جب مصالحت کی کوشش کی گئی تو ہمیشہ عراق نے مثبت رویہ اختیار کیا اور ایران نے منفی رویہ اپنایا اور خلیفہ چہارم کے نائب کا حال یہ ہے کہ وہ کسی بھی ایسے عرب ملک کو مسلمان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جو ان کے موقف کا حامی نہ ہو۔ان کا کھلا عزم یہ ہے کہ حرمین شریفین اور نجف اشرف کو فتح کر کے دنیا میں عدل حقیقی کا قیام عمل میں لائیں گے اور یہ عدل حقیقی اس وقت تک دنیا میں قائم نہیں ہوسکتا جب تک کہ روضۂ نبی پاک سے شیخین (ابوبکر وعمر) کی تربت کو علیحدہ کر کے ان کی جگہ حسن وحسین کی تربت کو عراق سے لا کر نہ رکھ دیا جائے اور اس کے لیے عراق وحجاز دونوں کا فتح کرنا ضروری ہے۔امام زماں کو امام زماں اور نائب خلیفہ چہارم بننے کے لیے عراق وحجاز دونوں کی ضرورت ہے۔حجاز کی تو اس لیے کہ وہ اسلام کا مرکز ہے اور عراق کی اس لیے کہ وہ علی کا دارالخلافہ تھا لہٰذا اب وہ عراق پر غلبہ کی کوششوں کے ساتھ حرم پاک پر بھی دست درازی کی ابتدا فرما چکے ہیں اور ایران کے حجاج اس حج کے لئے نہیں جاتے جو عبادت ہے اور ارکان دین سے ہے بلکہ سیاسی حج کی غرض سے جایا کرتے ہیں۔اس میں حج کے تلبیہ کے ساتھ امریکہ مردہ باد اور اللہ اکبر خمینی رہبر پکارنا ضروری ہے۔لیکن سعودی حکومت کے لوگ ظالم ہیں جو انہیں سیاسی حج سے روکتے ہیں۔

سننے میں آیا ہے کہ امسال ایرانی حجاج آستینوں میں خنجر چھپا چھپا کر لے گئے تھے اور جب انہیں ایسے نعروں سے پولیس کے محافظ دستے نے روکا تو وہ ان پر ٹوٹ پڑے اور تقریباً 80-85 افراد کو خنجر گھونپ کر ہلاک کر دیا اور پھر کس خوبصورتی سے اس کا رڈعمل امریکہ کے خلاف ظاہر کیا ہے۔گویا سعودی حکومت کی پولیس نے اپنی حفاظت کے لیے فائرنگ کی تو اس میں بھی امریکہ کی سازش کا دخل تھا ورنہ وہ صرف مار کھاتے اور ہاتھوں پر رائی جمائے بیٹھے رہتے۔

آخر جب تمام بڑی طاقتیں شیطانی طاقتیں ہیں اور ایران اسلحہ سازی میں خودکفیل بھی نہیں ہے تو یہ کثیر اسلحہ جو عراق سے اس کی جنگ میں صرف ہو رہا ہے کہاں سے آرہا ہے؟ ہندو پاکستان کے مابین صرف سترہ دن کی جنگ میں دونوں ملکوں کی ساری آتش بازی جل کر خاکستر ہوگئی اور جنگ کو آگے بڑھانے کی طاقت کسی میں نہ رہی لیکن آج ان دونوں ملکوں میں آٹھ سال سے خونریز جنگ جاری ہے اور پھر بھی اس جنگ کو آگے بڑھانے میں کسی شیطانی طاقت کا ہاتھ نہیں ہے؟ یہ بات محل غور ہے۔تقریباً آج سات سال کی مدت ہوئی میں نے رابطہ بین الملی ایران کی معرفت ایرانی رہنماؤں اور خاص کر خمینی صاحب کو لکھا تھا کہ آپ کی حیثیت ایک عالم دین کی ہے اور آپ اصلاح امت کے لیے اٹھے ہیں تو ایسی جنگ آپ کے شایانِ شان نہیں جو سراسر مسلمانانِ عالم کے مفاد کے خلاف اور دشمنانِ اسلام کے مفاد میں ہو۔لہٰذا آپ یک طرفہ طور پر اس جنگ کو روکنے کا اعلان کریں پھر صدام حسین کی مجال کیا ہے کہ جنگ بندی میں پس وپیش کرے۔اس کا جواب تو مجھے

موصول ہوا لیکن اس سے میں بالکل مطمئن نہ ہوا۔ وہ محض ایک عذر تھا۔

میں نے لکھا تھا کہ علی کی جانشینی کا دعویٰ صرف ایسے شخص کو زیب دیتا ہے جو علی جیسا بےنفس انسان ہو کہ دشمن اسلام کو قتل کرتے وقت اگر نفس کے انتقام کو دخل ہو جاتا تو دشمن کے سینے سے اتر کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور امام زماں وہ ہوگا جو صرف امتِ محمدی وملت ابراہیمی کا ایک فرد ہوگا وہ کسی شیعہ سنی کیمپ سے نمودار ہونے والا فرد نہ ہوگا۔

میں نے مذکورہ بالا سطور میں جس فتنۂ سبائیت کا بار بار تذکرہ کیا ہے اس کی بابت رابطہ والوں نے مجھے لکھا تھا کہ آپ بلا وجہ ایک افسانوی شخصیت کا ذکر بار بار دہراتے ہیں تو اس کے جواب میں میں نے لکھا تھا کہ عبداللہ بن سبا یمنی یہودی افسانوی شخصیت نہیں ہے بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ چنانچہ تاریخ طبری سے کئی صفحات مسلسل نقل کر کے ارسال کیے تھے جس میں عبداللہ بن سباء کا داخل اسلام ہو کر اپنے تخریبی پروگرام کے لئے ایک ایک صوبہ میں مراکز قائم کرنے اور اس کے بعد کے بڑے بڑے فتنوں کا ذکر پوری تفصیل سے موجود ہے۔ قتل حسین تو تاریخ خلافت یزید کا ایک واقعہ ہے لیکن سبائیت کی تباہ کاریوں سے پوری اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔ اعتقادی و عملی سطح پر اس گروہ نے سب سے زیادہ نقصان شیعہ فرقہ کو پہنچایا۔ ان کو 37 فرقوں میں تقسیم کر دیا اور ایسے ایسے مسائل وعقائد ان میں دین کے نام سے پھیلائے کہ جسے دین حق کی تخریب ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً متعہ دور جاہلیت میں سماجی عقد کی ایک شکل تھی۔ جب تک قرآن میں اس کی ممانعت کی آیت نازل نہ ہوئی بعض اصحاب رسول نے بھی اس کی اباحت کا فائدہ اٹھایا۔ لیکن کبار صحابہ واہل بیت نے یہ عمل خود نہیں کیا اور جب آیتِ حرمت نازل ہوئی تو اس کی حرمت کا اعلان کر دیا گیا جیسے شراب کہ وہ حلال کر کے دوبارہ حرام نہیں کی گئی تھی بلکہ وہ نزول حرمت سے پہلے اباحتِ اصلیہ پر تھی جسے اکثر صحابہ نوش کر لیتے تھے لیکن کبار صحابہ اور اہل بیت اس سے بھی اجتناب کرتے تھے۔ تو آج اگر متعہ کی بابت شیعہ وسنّی میں کوئی اختلاف ہو سکتا ہے تو صرف اسی دائرے میں ہونا چاہیے کہ وہ آج بھی جائز ہے یا اس کا جواز ختم ہو گیا، کیونکہ وہ سماجی نکاح کی ایک گھٹیا شکل تھی۔ ہر شخص خود کو فخر سے نکاح سے پیدا شدہ کہہ سکتا تھا۔ لیکن متعہ سے پیدا شدہ کہلانے میں ہمیشہ عار محسوس کی گئی۔ لیکن یہ شیعیت کے دین ومذہب میں سبائیت کی تخریب کاری نہیں تو اور کیا ہے۔؟

"من تمتع مرة كان درجته كدرجة الحسين عليه السلام، ومن تمتع مرتين فدرجته كدرجة الحسن عليه السلام، ومن تمتع ثلاث مرات كان درجته كدرجة علي ابن أبي طالب عليه السلام، ومن تمتع أربع مرات فدرجته كدرجة النبي صلى الله عليه وسلم"

"جو ایک بار متعہ کرے وہ حسن کے مرتبہ کو پالے اور جو دو دفعہ متعہ کرلے تو حسین کے درجہ پر فائز ہو، اور جو تین مرتبہ کر لے وہ علی کی منزلت کو پا لے اور چار مرتبہ متعہ کرے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ پر پہنچ جائے۔" نعوذ باللہ من ذلك

اس سے بڑا کفر نبی پاک کے ساتھ اور اہل بیت نبی کی اس سے بڑھ کر تحقیر و تذلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو اس شیعہ روایت سے ثابت ہوتی ہے۔ ابھی حال میں ایران کے ایک عالم نے بھی متعہ کی بابت ایسے ہی واہی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ گویا وہ سارے فضائل ومحاسن کا سرچشمہ ہے اور تقیہ یعنی دین کو چھپانا اور دین میں مصلحت آمیز جھوٹ بولنا تو وہ دین کے دس حصوں میں سے نو حصہ دین قرار دیا گیا گویا اب

شیعہ فرقہ کی دینی روایات کا اعتبار ہی نہ رہا۔ **لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم**

دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں جس میں جھوٹ بولنا عبادت ہو اور جس میں اس دین کو اظہار کے بجائے اِخفاء کی اجازت ہو لیکن اہل تشیع کے دین کو سبائیوں نے اس طرح مسخ کر کے رکھ دیا کہ اس میں اسے دس حصوں میں سے نو حصہ دین قرار دیا گیا ہے۔ یہ تمام تصریحات جب میں نے علماء ایران کو لکھ بھیجیں تو وہ بالکل خاموش رہے اور کسی ایک بات کا انکار نہ کر سکے۔

اہلِ سنن کااغواء

نوابین اودھ کے دور میں جب شیعہ فرقے کےلوگوں کے پاس بڑی بڑی ریاستیں اور جاگیریں تھیں انہوں نے حمایت حسین وآل حسین کے نام پرسنی حضرات کااغواکیااورانہیں محرم میں تعزیہ داری میں شرکت کی دعوت دی لیکن تعزیہ داری کے اس ڈرامے میں شیعوں نے اہل سنن کووہ تمام رول سونپے جوقاتلین حسین کے تھےاوروہ تمام رول خوداپنے لئے چن لئے جوحسین کےسوگواروں کے لیےموزوں تھےاوراس طرح دنیاپر یہ ظاہرکرنےکی کوشش کی کہ قاتل حسین دراصل اہل سنن ہی ہیں۔

تعزیہ سازی

یہ کام سنی مسلمانوں کی رنگریز برادری کے سپردکیاکہ وہ تعزیہ یعنی قبرحسین اپنے ہاتھوں سے بنائیں جبکہ حسین کے قاتلوں ہی نے ان کی نعش کوسپردخاک کیاتھا۔

نقارۂ جنگ

یہ نقارۂ جنگ سنی دفالی برادری سےمحرّم میں بجوایاگیاجبکہ کربلامیں طبل جنگ بجانےوالےحامیانِ حسین نہ تھے بلکہ قاتلین حسین ہی تھے۔

فوجی مارچ

اکھاڑے کےسنی ان پڑھ پہلوانوں کوتلواروں،نیزوں اورلاٹھیوں کااکھاڑہ نکالنے کی پیشکش کی گئی جس کوانہوں نے نادانی سے قبول کرلیاحالانکہ یہ عبداللہ بن زیاد کی بھیجی ہوئی فوج کی نقالی تھی۔

جلوس میں سنی خواتین کی شمولیت

شیعہ عورتیں تو محرم کے ایام میں ترک زینت اورماتمی سیاہ لباس پہن کراپنےگھروں کی چہاردیواری میں محصورہوجاتی ہیں اورسنی خواتین ریشمی لباس زیب تن کرکےتعزیہ کےجلوس میں حلیم،کباب،پراٹھااورکھچڑاکھاتے پھرتی ہیں حالانکہ ان کےاعلیٰ حضرت مولانااحمدرضا خان صاحب نےاس سےسختی سےمنع فرمایاہے۔

سنی علماءکےمواعظ

سنی علماءمحرّم میں بڑے رقت انگیزانداز سے داستانِ کربلااورواقعۂ شہادت سناتے ہیں اور یزید پرسبّ وشتم کرنےاورصحابہ کرام پر نادانستہ کیچڑاچھالنے میں شیعہ علماءسےبھی مسابقت کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کاموقف صحابہ واہل بیت دونوں ہی سےمحبت وعقیدت کاہے۔یزیدکویزیدپلیدکہہ کروہ گویامحبت اہل بیت کاحق اداکرتے ہیں لیکن وہ اتنابھی نہیں سوچتے کہ یزیدکوخلیفہ بنانےوالےمعاویہ ہی ہے جو صحابی رسول اورکاتبین وحی میں سے تھے۔کیاخداکوان کے بعدکےحالات کاعلم نہ تھاکہ بذریعہ وحی اپنےنبی کومنع فرمادیتاکہ معاویہ سے

قرآن کی کتابت نہ کروائیں۔ نیز یزید کی بیعت کرنے والوں میں صحابہ کی ایک خاصی تعداد بھی جنہوں نے اس کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی تھی۔

یزید کیسا شخص تھا؟ اس کا اندازہ آج ہم سبائی روایات کی روشنی میں کر رہے ہیں اور وہ بھی چودہ صدیوں کے بعد لیکن کبارِ صحابہ جیسے ابن عمر، ابن عباس وغیرہ کیا وہ اس کے ذاتی حالات سے اتنے بھی واقف نہ تھے جتنے آج ہم اپنے آپ کو سمجھ رہے ہیں۔ امیر بننے والے کی تو اپنی غرض ہوتی ہے کہ انتہائی نااہلی کے باوجود اس کی تمنا کرسکتا ہے لیکن ان اصحاب رسول کو کیا ہوا تھا جنہوں نے کسی اور کی امارت کی خاطر اپنی عاقبت کا سودا کرنا گوارا کرلیا۔ لہٰذا اپنی جانب سے نہ تو ہم اس پر تنقید کرنا چاہتے ہیں اور نہ تائید بلکہ اس آیت قرآنی کی روشنی میں اس کا معاملہ خدائے علیم و بصیر کے حوالہ کرتے ہیں: تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ"

یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، اس کے نیک و بد کی تمام تر ذمہ داری ان ہی پر ہے اور تم سے ان کے اعمال کی بابت سوال نہ کیا جائے گا.
" (البقرہ:134)

ہاں وہ مسلمان انتہائی قابل ملامت ہے جنہوں نے حسین سے ہر طرح کا عہد و میثاق کیا اور پھر ان کی مدد کو نہ پہنچے اور ظالموں کے ہاتھوں انہیں شہید کرادیا۔

یہ شہر ممبئی ایک مدت دراز سے سنی و شیعہ علماء کی مرثیہ خوانی و عزاداری کے مقابلوں کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ پیشہ ور نوحہ خواں اور عزادار علماء و شعراء کی اس شہر میں بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے بعض شعلہ بیاں سنی مولوی صاحبان جو یزید کو گالیاں دینے میں اپنا جواب نہیں رکھتے یہاں کے شیعہ عوام کی طرف سے بھی بڑے اعزاز و اکرام کے مستحق بنتے ہیں اور پھر فخر سے کہتے ہیں:

اس طرح کہتے ہیں سنی داستان اہل بیت

یعنی داستان اہل بیت اور واقعات کربلا خود اہل بیت کے ذکر کردہ واقعات کے بالکل برعکس بیان کئے جاتے ہیں اور سبائیت کی ہمنوائی کا پورا پورا حق ادا کردیا جاتا ہے خواہ اس کی زد جا کر اصحاب رسول پر پڑے یا خود اہل بیت پر۔

میری شیعہ و سنی بھائیوں سے گزارش ہے کہ اگر واقعی انہیں اہل بیت سے محبت و عقیدت ہے تو تمام اصحاب رسول اور معاویہ کی بابت وہی موقف اختیار کریں جو خود اہل بیت کا تھا اور سبائیت کے اغوا سے خود کو آزاد کرنے کی صورت پیدا کریں جس کا اگر ایک وار اصحاب رسول پر ہے تو دوسرا اہل بیت پر۔

اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اہل بیت اور اصحاب رسول کے نقش قدم کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام

حکیم ابوالحسن عبیداللہ خان رحمانی

10 محرم الحرام 1407ھ